اردو تحریر و انشا میں سرزد ہونے والی اغلاط کی اصلاح

زبانِ خامہ کی خامیاں
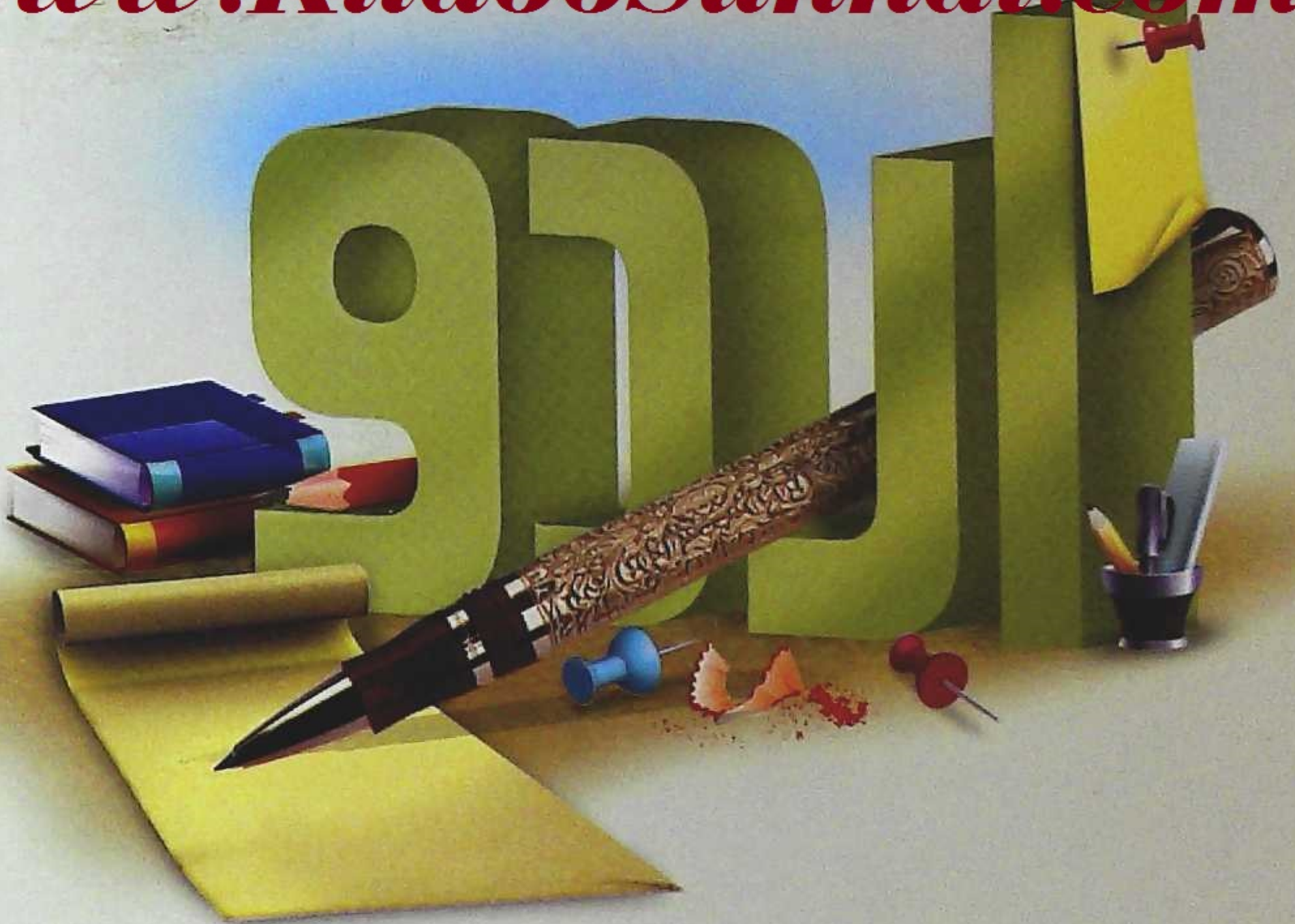
از قلم علیم ناصری رحمہ اللہ اضافہ مولانا محمد اسحاق بھٹی رحمہ اللہ

پیش لفظ حافظ صلاح الدین یوسف حفظہ اللہ نظرثانی محسن فارانی حفظہ اللہ

دار ابی الطیب

للنشر و التوزیع

بسم اللہ الرحمن الرحیم

زبانِ خامہ کی خامیاں

تالیف
علیم ناصری رحمہ اللہ

اضافہ
محمد اسحاق بھٹی رحمہ اللہ

اشاعت اول .... مئی 2017ء

تعداد 1000

بیت السلام پرنٹنگ پریس
042-37320422,0321-9350001

دار ابی الطیب
للنشر والتوزیع

گل روڈ، حمید کالونی، گلی نمبر 5، گوجرانوالہ 055-3823990

فہرست

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ابتدائیہ

ہر زبان کی ترقی کے لیے ضروری ہے کہ اس کے اصول و قواعد کا مطالعہ اور اہتمام کیا جائے، تاکہ اس کے لکھنے اور پڑھنے پڑھانے میں کسی قسم کی غلطی راہ نہ پا سکے۔ دیگر زبانوں کی طرح ہماری قومی زبان اردو کے بھی طے شدہ اصول اور قوانین موجود ہیں، جن کی پابندی کرنا ہر صاحبِ قلم کے لیے ضروری ہے۔ بنابریں اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ پہلے ہم اردو زبان کے ان ضوابط سے آگہی حاصل کریں اور پھر لکھتے وقت ان قوانین کا التزام کریں، تاکہ ہم بالکل درست اور معیاری زبان لکھنے کے قابل ہو سکیں۔

آج اگر اس حوالے سے اپنے گرد و پیش پر نظر ڈالی جائے تو بہت افسوس ناک صورتِ حال دیکھنے کو ملتی ہے۔ بسا اوقات ذرائع ابلاغ میں بھی ہمیں غلط زبان ہی سننے اور پڑھنے کو ملتی ہے، جس کی بنیادی وجہ اردو زبان کے قواعد اور روز مرہ سے ناواقفیت ہے۔

زیرِ نظر کتاب ''زبانِ خامہ کی خامیاں'' میں اردو تحریر و انشا میں عام طور پر سرزد ہونے والی اہلِ علم و قلم کی اغلاط کو موضوعِ بحث بنایا گیا ہے اور تفصیل کے ساتھ عبارت آرائی میں الفاظ، جملوں اور تراکیب کی اصلاح کے ساتھ ساتھ

بعض ایسے عمومی قواعد کا تذکرہ کیا گیا ہے جن کی بدولت ہم صحیح زبان لکھنے پر قادر ہو سکتے ہیں۔ اس کتاب کے مصنف ہمارے ملک کے معروف ادیب و شاعر اور نامور صحافی جناب علیم ناصری صاحب ہیں، جن کے قلمِ گوہر بار سے شعر و ادب سے متعلق کئی کتب معرضِ اشاعت میں آ کر اصحابِ ذوق سے داد و تحسین حاصل کر چکی ہیں۔

محترم علیم ناصری صاحب یکم ستمبر 1919ء کو ضلع لاہور کے ایک گاؤں سھراؤں میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں میں حاصل کی۔ میٹرک پٹی (ضلع امرتسر) میں پاس کیا، پھر فوج میں بھرتی ہو گئے اور 1940ء کی جنگِ عظیم دوم میں عملاً حصہ لیا۔ قیامِ پاکستان کے بعد جنگِ کشمیر میں بھی دادِ شجاعت دیتے رہے۔ فوج سے ریٹائرمنٹ کے بعد انھوں نے محکمۂ صحت میں ملازمت کر لی۔

جنگ میں عملاً حصہ لینے، پھر وادیٔ کشمیر میں مجاہدانہ ذمے داریاں نبھانے اور عسکری ماحول میں رہنے کی وجہ سے جہاد ان کی زندگی کا مرکزی نقطہ اور نشانِ راہ بن گیا، چناں چہ سرزمینِ ہند میں آزادی کے لیے پہلی جہادی تحریک، یعنی سیدین شہیدین کی جماعتِ مجاہدین کی جہادی سرگرمیاں ان پر اس طرح اثر پذیر ہوئیں کہ انھوں نے اپنی فنی و علمی صلاحیتیں اسی تحریک کی نذر کر دیں اور داد و بے داد سے بے نیاز اور خواہشِ اشاعت سے مبرا رہ کر انھوں نے اس پوری تاریخ کو ''شاہنامۂ اسلام'' کے انداز پر مرتب کیا، اور یوں اُن کی یہ کاوش ''شاہنامۂ بالاکوٹ'' کے عنوان سے منظرِ عام پر آئی، جو پندرہ ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔[1]

[1] ہفت روزہ ''الاعتصام'' (لاہور) 6/جنوری 2006ء

15000 اشعار پر مشتمل مثنوی ''شاہنامہ بالاکوٹ'' کے علاوہ ان کا نعتیہ مجموعۂ کلام ''طلع البدر علینا'' (جس نے 2000ء میں سیرت ایوارڈ حاصل کیا) رثائی نظموں کا مجموعہ ''متاعِ دیدہ و دل'' نیز ''بدر نامہ'' اور ''احد نامہ'' کے نام سے ان کی شعری کتب ان کی ادبی صلاحیت اور زبان و بیان میں مہارت کا بیّن ثبوت ہیں۔

حضرت علیم ناصری مرحوم پہلے تو کچھ عرصہ ہفت روزہ ''اہلِ حدیث'' لاہور کی ادارت میں شامل ہوئے، پھر مختلف ادوار میں چھے سال سے زیادہ عرصہ ہفت روزہ ''الاعتصام'' (لاہور) کے مدیر رہے، جس کے دوران میں انھوں نے اس رسالے کی ترتیب و تدوین کے ساتھ ساتھ اداریے، مضامین اور تبصرہ جات لکھنے کا فریضہ نبھایا۔ اس دوران میں مرحوم نے شاعری کے چند مجموعے بھی مکمل کیے۔ نثر میں ان کا قلم نہایت رواں، زبان بہت شستہ، ابلاغ آسان اور بیان گل و گلزار ہوتا تھا۔ نئے لکھاریوں اور شاعروں کے لیے ان کا وجود ازبس غنیمت تھا۔ جب بھی کوئی قلمکار راہنمائی کا خواستگار ہوتا، بزرگانہ شفقت سے جواب دیتے اور جو شعرا اصلاح کے لیے اپنا کلام بھیجتے، خندہ پیشانی سے نہ صرف ان کی اصلاح فرماتے، بلکہ آیندہ کے لیے مفید مشوروں سے بھی نوازتے۔[1]

مولانا اسحاق بھٹی مرحوم اپنے دیرینہ دوست علیم ناصری صاحب کی کتاب ''متاعِ دیدہ و دل'' کے دیباچے میں ان کی شعری و ادبی صلاحیت کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

[1] ہفت روزہ ''الاعتصام'' (لاہور) 6/جنوری 2006ء

علیم ناصری کی شاعری کا آغاز اسی زمانے میں ہو گیا تھا جب وہ اپنے گاؤں کے خالصہ مڈل سکول کے ودیارتھی (طالب علم) تھے۔ وہ اپنا (پنجابی) کلام سکول کے جلسوں میں سنایا کرتے تھے۔ بقول ان کے وہ سکھوں کے گرو صاحبان کی منقبتیں گورمکھی میں لکھتے اور پڑھتے تھے۔ ان کا وہ تمام کلام 1947ء کی ہجرت میں گاؤں ہی میں رہ گیا، کیوں کہ وہ اس وقت فوج میں تھے اور گھر کے لوگ بہت مختصر سامان اپنے ساتھ لا سکے تھے۔ کاغذات اور چند کتابوں کو غیر ضروری سمجھ کر وہیں چھوڑ دیا گیا، جن میں ان کا میٹرک کا وہ سرٹیفکیٹ بھی تھا جو پنجاب یونیورسٹی کا جاری کردہ تھا اور اس پر اس وقت (1938ء) میں وی سی جناب ایس پی سنگھا کے دستخط تھے۔

انھوں نے دینیات کی تعلیم تو اپنے گھریلو ماحول کے مطابق ہی پائی تھی اور کچھ اپنے ذاتی مطالعے اور فطری ذوق کے تحت کتاب و سنت کے علما تک رسائی حاصل کی تھی۔ لیکن اس میں صحیح سمت کا تعین مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی رحمہ اللہ کے خطباتِ جمعہ میں حاضری سے ہوا۔ نیز سرکاری ملازمت کے دنوں میں بعض اوقات ان سے مکتبہ سلفیہ میں بالمشافہہ ملاقاتوں میں بھی استفادہ کیا۔ وہ اس امر کا بڑی مسرت اور عقیدت مندی سے ذکر کرتے ہیں۔ ان کی بیشتر نظمیں بھی ''الاعتصام'' میں اس وقت شائع ہونے لگی تھیں، جب یہ پرچہ مرکزی جمعیت سے واپس مولانائے موصوف کی تحویل میں آ گیا تھا۔ مولانا خود بھی ان کی شاعری کے مداح اور اطاعت شعاری پر بہت خوش تھے۔ ہفت روزہ ''تنظیم اہلِ حدیث'' میں بھی ان کی نظمیں اکثر شائع ہوتی رہی ہیں۔ 1965ء

اور 1971ء کی جنگوں پر رجزیہ نظمیں اور دینی اور معاشرتی شاعری ان کے کلام کی پختگی کی آئینہ دار ہیں۔

ناصری صاحب 1979ء میں سرکاری ملازمت سے ریٹائرڈ ہو گئے اور 1980/81 میں مرکزی جمعیت کے ترجمان ''اہلِ حدیث'' میں مدیر معاون کے طور پر خدمات انجام دیتے رہے۔ 1982ء میں وہاں سے بوجوہ الگ ہو گئے اور پھر مولانا محمد عطاء اللہ حنیف رحمہ اللہ کے حکم پر ''الاعتصام'' میں آ گئے۔ ''الاعتصام'' ان کے لیے نہ صرف سایۂ عاطفت بنا، بلکہ قلم و قرطاس کی جولانیاں دکھانے کے لیے ایک وسیع میدان ثابت ہوا۔ مولانا کی تربیت سے مطبوعات پر تبصرہ نگاری اور اداریہ نویسی کے نکات کا فن یہیں حاصل کیا۔[1]

حضرت ناصری مرحوم کے اخلاقِ کریمانہ اور بزرگانہ شفقت کی چند جھلکیاں ان کے زیرِ سایہ تربیت پانے والے ان کے شاگردِ رشید جناب سلیم چنیوٹی صاحب نے اپنی ایک تحریر ''بابا جی علیم ناصری کی یادیں'' میں پیش کی ہیں، جنھیں پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ مرحوم کس درجہ ملنسار اور عمدہ اخلاق کے مالک تھے۔

جناب سلیم چنیوٹی صاحب لکھتے ہیں:

''مرحوم بابا جی شفیق و خلیق، ذہین و فطین، ملنسار، خوش خصال اور عظیم انسان تھے۔ ان کی چھیاسی برسوں پہ محیط بھرپور زندگی علم و عمل اور تعلیم و تعلم میں گزری۔ راقم 1990ء کے مارچ میں موصوف سے متعارف ہوا۔ دار الدعوۃ السلفیہ کی بلڈنگ میں اُن دنوں ''دار الایتام'' کے نام سے ایک ادارہ کام کرتا تھا۔ اس

[1] ''متاعِ دیدہ و دل'' (دیباچہ)

وقت ہفت روزہ ''الاعتصام'' اور سلفیہ لائبریری کے عملے میں بابا جی علیم ناصری رحمہ اللہ، مولانا محمد سلیمان انصاری رحمہ اللہ، حضرت قاری نعیم الحق نعیم رحمہ اللہ اور مکرم و محترم حافظ صلاح الدین یوسف حفظہ اللہ رونق افروز ہوتے تھے۔

چنیوٹ میں میری کریانے کی دکان تھی۔ یہ دکان چھوڑ کر میں نے لاہور دار الایتام میں کام شروع کیا۔ دار الایتام کا باقاعدہ آڈٹ ہوتا تھا۔ میں نے جب پہلی ششماہی کا حساب تیار کیا تو وہ اکاؤنٹنگ کے قواعد وضوابط کے مطابق نہ تھا۔ دار الدعوۃ السلفیہ اور دار الایتام کے ناظمِ مالیات محترم میاں عبدالمعید مرحوم مالواڈہ رحمہ اللہ بڑے ہی شفیق وخلیق انسان تھے۔ یہ حسابات لے کر میں میاں صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ میاں صاحب اپنے گھر واقع اسد جان روڈ لاہور کینٹ میں تشریف فرما تھے، مجھے بیٹھنے کو کہا اور حسابات دیکھتے ہی فرمانے لگے: بھئی! یہ کیا ہے؟

یہ کیا ہے؟ ..... میں نے سنا تو میں پریشان ہو گیا۔ حساب چونکہ قاعدے کے مطابق نہ لکھا گیا تھا، میاں صاحب فرمانے لگے: پہلے حساب بنانا سیکھو، پھر اس کام کی ذمے داری قبول کرو۔ میں اُن کے گھر سے سیدھا دفتر ''الاعتصام'' پہنچا اور پریشان تھا کہ دفتر الاعتصام میں تشریف فرما حضرت قاری نعیم الحق نعیم رحمہ اللہ نے میرے چہرے پہ پریشانی کے آثار دیکھے اور مجھ سے دریافت کیا کہ کیا بات ہے؟ میں نے ساری بات بتا دی۔ اب حضرت قاری صاحب نے فرمایا: ''کوئی بات نہیں، جناب علیم ناصری صاحب کو اپنا حساب وغیرہ دکھاؤ اور ان سے مشورہ کر کے اسے دوبارہ تیار کرو۔ ان شاء اللہ تعالیٰ تمھارا حساب صحیح ہو جائے گا۔''

حضرتِ قاری صاحب کے ڈھارس بندھانے کے بعد میں نے جناب علیم ناصری صاحب کو حساب دکھایا تو حضرت ناصری صاحب مسکرانے لگے اور ناصحانہ طور پر فرمانے لگے: ''کریانے کے حساب اور دفتری حساب میں فرق ہوتا ہے۔ حساب تو حساب ہی ہوتا ہے، بس لکھنے کے انداز الگ الگ ہیں۔'' اب ناصری صاحب نے بڑے آسان طریقے سے مجھے حساب لکھنے کا طریقہ سکھایا۔ میں نے دوبارہ اس حساب کو تیار کیا تو میاں عبدالمعید صاحب بھی مطمئن ہو گئے اور میری حسابی رپورٹ بھی درست قرار دی گئی۔

دفتر ''الاعتصام'' میں بڑی رونق رہتی تھی۔ علمی و ادبی شخصیات اور دفتری امور کے متعلق لوگ یہاں آتے رہتے تھے۔ حافظ صلاح الدین یوسف حفظہ اللہ اور قاری نعیم الحق نعیم رحمہ اللہ دار الدعوۃ السلفیہ کی تیسری منزل پر قائم سلفیہ لائبریری میں، اور جناب ناصری صاحب اور مولانا محمد سلیمان انصاری مرحوم ''الاعتصام'' کے دفتر میں تشریف فرما ہوتے تھے۔

راقم اس حوالے سے خود کو بہت خوش نصیب سمجھتا ہے کہ ان عظیم شخصیات کی مجھ جیسے نوآموز کو تربیت و شفقت میسر آئی اور ان نابغہ روزگار ہستیوں کی خدمت کی سعادت نصیب ہوئی۔

جناب علیم ناصری جماعتی حلقوں میں تو معروف تھے ہی، مگر قومی سطح پر بھی اہلِ علم و ادب میں انھیں ایک بلند مقام حاصل تھا۔ ریڈیو پاکستان کے پروگرام ''روشنی'' میں ایک عرصے تک ان کی تقاریر نشر ہوتی رہیں۔ پنجاب یونیورسٹی اور دیگر قومی نعتیہ مشاعروں میں ان کو مدعو کیا جاتا۔ نیز شعرا و ادبا میں علمی اور فنی

شہرت بھی حاصل کی۔

بابا جی علیم ناصری بڑے مضبوط اعصاب کے مالک انسان تھے۔ ان کے قلم سے تمام اصناف کے شعر نکلے۔ حمدیہ، نعتیہ، مثنوی، رباعی، نظم، غزل، رزمیہ شاعری وغیرہ پر گوہر افشانی فرماتے تھے۔ اہلِ حدیث کی مسلکی، تبلیغی اور تحریکی تگ وتاز میں ان کا ایک بڑا حصہ ہے۔ بڑے بڑے علما، شیوخ الحدیث اور خطبا کی وفات یا ناگہانی حادثات و واقعات کے مواقع پر ان کے قلم نے شعروں میں اپنے دکھ کا اظہار کیا ہے۔

''شاہنامۂ بالاکوٹ'' میں شہدائے کرام اور جناب سیدین شہیدین ؒ اور ان کے ساتھیوں کے ایمان افروز واقعات و احوال بھی ہیں۔ بعض شعر پڑھتے ہوئے اہلِ دل کی آنکھیں آنسو برسانا شروع کر دیتی ہیں۔ دیگر رسائل و جرائد میں حالاتِ حاضرہ پر ان کے شعر عین حالات کی تصویر کشی معلوم ہوتے۔

بابا جی سے ہمیں بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا۔ دفتری امور کی انجام دہی میں بابا جی نے بڑا ساتھ دیا۔ جماعتی خبریں اور مضمون نویسی کے طریقے بڑے آسان انداز میں سمجھاتے تھے۔ ان کی طبیعت میں کبھی ترشی نہ دیکھی گئی۔ نکتہ بیاں اور نکتہ آفریں شخصیت کے مالک تھے۔ بات کرتے کرتے دلچسپی کا سامان پیدا کر دیتے تھے۔ ان کی بڑی بڑی لطیف و شگفتہ باتیں ہمیں ہمیشہ یاد رہیں گی۔[1]

''زبانِ خامہ کی خامیاں'':

زیرِ نظر کتاب حضرت علیم ناصری مرحوم کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو وہ

[1] ہفت روزہ ''الاعتصام'' (لاہور) 5/فروری 2010ء

''زبانِ خامہ کی خامیاں'' کے عنوان سے ہفت روزہ ''الاعتصام'' (لاہور) میں لکھتے رہے۔ یہ مضامین چونتیس قسطوں میں اشاعت پذیر ہوئے، جن کا دورانیہ تقریباً دس سال ہے، جس کی وجہ یہ ہے کہ ان اقساط کی اشاعت میں کافی انقطاع رہا اور یہ مضمون تسلسل سے نہ شائع ہو سکا، بلکہ بسا اوقات تو پورے سال میں اس کی دو تین اقساط ہی دیکھنے کو ملتی ہیں۔ اس مضمون کی پہلی قسط ''الاعتصام'' کے 5/اگست 1994 کے شمارے میں شائع ہوئی، جب کہ آخری قسط 22/اکتوبر 2004ء کی اشاعت میں طبع ہوئی۔ چونکہ یہ مضمون مختلف اوقات میں شائع ہوتا رہا ہے، اس لیے ہمیں اس میں موضوعاتی ترتیب نظر نہیں آتی، جو ایک مرتب کتاب میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ علاوہ ازیں اس میں کئی مقامات پر تکرار بھی تھا، جو ہم نے کافی حد تک کم کر دیا ہے، البتہ ان مضامین کی ترتیب میں رد و بدل کرنے کے بجائے انھیں ویسا ہی رہنے دیا ہے، جیسا اصل میں موجود تھا۔

جب حضرت علیم ناصری مرحوم نے ہفت روزہ ''الاعتصام'' میں یہ مضامین لکھے تو اسی دوران میں جناب مولانا محمد اسحاق بھٹی مرحوم نے بھی اسی موضوع پر چند مضمون لکھے، جو موضوع کی مناسبت اور افادیت کے پیشِ نظر ہم نے اس مجموعے کے آخر میں شامل کر دیے ہیں۔ زیرِ نظر کتاب میں تقریباً ڈیڑھ صد صفحات جناب علیم ناصری ؒ کے تحریر کردہ ہیں، جب کہ حضرت مولانا اسحاق بھٹی مرحوم کے رقم کردہ مضامین قریباً پچاس صفحات پر مشتمل ہیں۔ حضرت بھٹی صاحب مرحوم کے یہ طویل مضامین ہفت روزہ ''الاعتصام'' کی تین اشاعتوں (7/اپریل، 19/مئی اور 25/اگست 1999ء) میں شامل تھے۔

ان کے علاوہ ہفت روزہ ''الاعتصام'' ہی میں اسی موضوع پر مولانا خالد سیف، جناب حیات عبداللہ، پروفیسر سعید عابد، حکیم عبدالرحمان خلیق اور فضل اکبر کاشمیری کے مضامین بھی وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے، جنھیں ہم نے افادیت کی بنا پر اسی مجموعے میں شامل کر دیا ہے۔ اسی طرح ان مضامین میں بعض مقامات پر چند حواشی حضرت قاری نعیم الحق نعیم رحمہ اللہ کے بھی پڑھنے کو ملیں گے، جو انھوں نے ''الاعتصام'' کے اپنے زمانۂ ادارت میں شائع ہونے والے بعض مضامین پر لکھے تھے۔ حضرت قاری صاحب مرحوم چار سال (13/ جنوری 1995ء تا 29/ جنوری 1999ء) ''الاعتصام'' کے مدیر رہے۔ ان کی وفات 31/ جنوری 1999ء کو دفتر ''الاعتصام'' جاتے ہوئے ٹرین سے اترتے وقت گرنے سے واقع ہوئی۔ رحمه الله رحمة واسعة.

امید ہے اردو تحریر و انشا میں اصلاحی نقطۂ نظر سے لکھے جانے والے مضامین کا یہ مجموعہ اردو دان طبقے بالخصوص مدارس اور کالجوں کے طلبا کے لیے بہت مفید ثابت ہوگا۔ اللہ تعالیٰ اس مجموعے کے تمام مرحوم مولفین اور موجودین کو اپنی مغفرت و رحمت سے نوازے۔

اسی طرح ہم جناب محسن فارانی (ریسرچ اسکالر دار السلام، لاہور) کے شکر گزار ہیں جنھوں نے اس مجموعے کو باریک بینی سے پڑھا اور کئی مقامات پر بیش قیمت حواشی لکھے اور مفید مشوروں سے نوازا، جن کی بدولت اس کتاب کی افادیت میں اضافہ ہوا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے فضیلۃ الشیخ حافظ صلاح الدین یوسف حفظہ اللہ کو جنھوں نے ہماری درخواست پر کتاب ملاحظہ

کرنے کے بعد اس پر پیش لفظ کے عنوان سے مفید باتوں کا اضافہ کیا۔ ناسپاسی ہوگی اگر اس کتاب کی طباعت و اشاعت کی کوشش کرنے والے حضرات کا شکریہ ادا نہ کیا جائے، بالخصوص فضیلۃ الشیخ فلاح خالد المطیری حفظہ اللہ (رئیس لجنۃ القارۃ الہندیہ۔ کویت) اور محترم المقام مولانا عارف جاوید محمدی حفظہ اللہ (رئیس مرکز دعوۃ الجالیات۔ کویت) ہمارے خصوصی شکریے کے سزاوار ہیں، جن کے تعاون اور سرپرستی کی وجہ سے اس کتاب کی طباعت عمل میں آئی۔

اللہ تعالیٰ انھیں اور دیگر تمام معاونین کو جزائے خیر عطا فرمائے اور اس عمل کو قبولیت سے سرفراز فرما کر ہمارے لیے توشۂ آخرت بنائے۔ آمین یا رب العالمین

والسلام

حافظ شاہد رفیق

۱۹/ جمادی الأخریٰ ۱۴۳۸ھ = ۱۹/ مارچ ۲۰۱۷ء

hasanshahid85@hotmail.com

پیش لفظ

خامہ، فارسی زبان میں ''قلم'' کو کہتے ہیں۔ ''زبانِ خامہ کی خامیاں'' کا مطلب ہے اہلِ قلم یا مضمون نگار اپنی اردو تحریروں میں جو ایسی غلطیاں کرتے ہیں جو اردو زبان کے اصول و قواعد کے خلاف یا اہلِ زبان کے روزہ مرہ کے خلاف ہیں۔

اردو کے ''اہلِ زبان'' دہلی میں رہنے والوں کو کہا جاتا ہے یا بعض کے نزدیک لکھنؤ کے باشندوں کو بھی اس میں شمار کیا گیا ہے۔ یعنی اردو زبان کی یہ دو ٹکسالیں ہیں۔ ان دو ٹکسالوں کی اردو زبان کو معتبر سمجھا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہندوستان میں اگرچہ اردو ہر شہر میں بولی جاتی رہی ہے اور بولی جاتی ہے، لیکن ہر جگہ (سوائے دہلی اور لکھنؤ کے) اردو کی بگڑی ہوئی شکلیں رائج رہی ہیں اور اب بھی شاید یہی صورتِ حال ہو، بلکہ اب تو بھارتی حکومت کی ہندو نوازیت کی وجہ سے اردو میں ہندی اور سنسکرت کے الفاظ کی بھی بکثرت آمیزش ہوگئی ہے۔

پنجاب میں بھی اردو زبان کا چلن عام رہا ہے اور بحمد اللہ اب بھی ہے۔ اسی لیے پنجاب کے بعض اہلِ قلم اور اہلِ علم اردو محاوروں اور طریقِ استعمال میں دہلی کی ٹکسالی زبان کے اجارے کے قائل نہیں ہیں اور کہتے ہیں کہ اہلِ پنجاب بھی اردو کے دیوانے ہیں اور اس کی ترقی اور نشوونما میں پنجاب کے اہلِ قلم کا

حصہ بھی دہلی اور لکھنؤ والوں سے کم نہیں ہے۔ اس لیے اردو تراکیب اور محاوروں میں ''پنجابیت'' کا ''تڑکا'' لگانے میں کوئی حرج نہیں ہے (یاد رہے اردو میں ''تڑکے'' کو ''بھگار لگانا'' کہا جاتا ہے)۔

بہر حال یہ ایک علمی بحث ہے، جس کا فیصلہ اہلِ علم ہی صحیح معنوں میں کر سکتے ہیں۔ تاہم عوام الناس کو یا عام اہلِ قلم کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ اپنی بول چال یا اردو تحریر میں اردو کی ٹکسالی زبان کے برعکس اپنی ''پنجابیت'' کو اس میں داخل کریں۔ علاوہ ازیں معیاری اور ٹکسالی اردو کا فیصلہ کرنے کے لیے اردو کی معتبر لغات بھی ایک قابلِ اعتبار سند کا درجہ رکھتی ہیں۔ اردو میں لکھنے والوں کو اہلِ زبان کے ساتھ ساتھ اس ''سند'' کو بھی سامنے رکھنا چاہیے۔

اہلِ پنجاب کو بلاشبہ اردو زبان کے ساتھ بڑی محبت ہے اور اس کی سب سے بڑی وجہ اردو کی شائستگی اور تہذیبی رکھ رکھاؤ کے علاوہ اس کی ''اسلامیت'' بھی ہے۔ یعنی عربی زبان کے بعد اسلامی علوم وفنون کا سب سے بڑا ذخیرہ اردو زبان میں ہے۔ یہ ذخیرۂ اسلامیات اردو زبان کے ماتھے کا جھومر ہے، جو اس کے لیے ایک بڑا اعجاز اور باعثِ فخر ہے۔ اس لیے ہر محبِ اسلام کا یہ شرعی فریضہ بھی ہے کہ اردو زبان کو علاقائی اور لسانی تعصبات کی نظر سے نہ دیکھے۔ قیامِ پاکستان میں بھی اس کا ایک نہایت اہم کردار ہے اور پاکستان کے چاروں صوبوں کو باہم ملا کر رکھنے کے لیے بھی یہ باہم رابطے کی واحد زبان ہے۔

اس کی اس سہ گونہ حیثیت کی وجہ سے برصغیر کے تمام مسلمانوں کو بالعموم اور اہلِ پاکستان کو بالخصوص اس کی حفاظت کا خصوصی اہتمام کرنا چاہیے اور ایسے

شوائب اور آمیزش سے اُن کو پاک رکھنا چاہیے، جس سے اردو زبان کا حسن مجروح ہو اور اس کی لطافت میں کمی آئے۔

الحمد للہ پنجاب کے اہلِ علم وقلم کو اس کا احساس ہے۔ اسی لیے بعض اہلِ قلم اور اہلِ علم ان غلطیوں کی نشان دہی کرتے رہتے ہیں جو اردو زبان کی تحریر و انشا میں بعض اہلِ قلم کرتے ہیں۔

انھی اہلِ علم وقلم میں ہماری جماعت کے دو نامور بزرگ بھی ہیں جو ہفت روزہ ''الاعتصام'' (لاہور) کے مدیر بھی رہے ہیں اور اردو کے بہترین نثر نگار اور صاحبِ طرز ادیب بھی ہیں، جب کہ ایک ان میں نہایت پختہ کار شاعر بھی ہیں۔ اول مولانا محمد اسحاق بھٹی صاحب، جنھوں نے شخصیت نگاری میں بڑا نام کمایا ہے۔ دوسرے علیم ناصری صاحب، جنھوں نے سید احمد شہید اور شاہ اسماعیل کی تحریکِ جہاد اور ان کی اصلاحی مساعی اور جہادی معرکہ آرائیوں کو ''شاہنامہ بالاکوٹ'' کے عنوان سے نظم کے قالب میں ڈھال کر ایک تاریخی کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ رحمهما الله تعالىٰ وأجزل ثوابهما.

ان ہر دو حضرات نے پنجاب کے اہلِ علم کی بہت سی غلطیوں کی اصلاح کے لیے متعدد مرتبہ مضامین لکھے جو ''الاعتصام'' میں شائع ہوتے رہے۔ بد قسمتی سے یہ غلطیاں بہت عام ہیں، بالخصوص اردو کے مذکر الفاظ کا مؤنث استعمال عام ہے، جیسے:

عوام، مذکر ہے۔ اس کو مؤنث استعمال کرنا ہے۔

ٹکٹ، مذکر ہے۔ اس کو مؤنث استعمال کرنا ہے۔

اخبار، مذکر ہے۔ اس کو مؤنث استعمال کرنا ہے۔

درد، مذکر ہے۔ اس کو مؤنث استعمال کرنا ہے۔

کلام، مذکر ہے۔ اس کو مؤنث استعمال کرنا ہے۔

انتظار، مذکر ہے۔ اس کو مؤنث استعمال کرنا ہے۔

مرض، مذکر ہے۔ اس کو مؤنث استعمال کرنا ہے۔ وغیرہ وغیرہ

ان کے علاوہ اور بھی بعض غلطیاں بڑے بڑے اہلِ قلم اور اخبارات کے نامور کالم نگار کرتے ہیں۔ ان میں ایک نہایت نمایاں غلطی ''سمجھ'' کے استعمال میں کرتے ہیں، مثلاً: ''مجھے سمجھ نہیں آتی۔'' حالانکہ لکھنا چاہیے: ''میری سمجھ میں نہیں آتا۔'' وعلی ہذا القیاس، اس طرح کی متعدد غلطیاں عام ہیں۔

محترم علیم ناصری صاحب اور مولانا بھٹی صاحب رحمہ اللہ نے اپنے مضامین میں اس طرح کی متعدد غلطیوں کی نشان دہی اور صحیح طریقِ استعمال کی وضاحت کی ہے۔ یہ مضامین ''الاعتصام'' کے صفحات میں محفوظ، بلکہ مدفون تھے، حافظ شاہد محمود صاحب سلمہ اللہ کو اللہ جزائے خیر عطا فرمائے، انھوں نے اس مدفون خزانے کو کتابی شکل میں منظرِ عام پر لا کر ان کو ایک نئی زندگی عطا کر دی ہے، جس پر وہ بجا طور پر اہلِ علم وقلم کے شکریے اور قدر افزائی کے مستحق ہیں۔

ہر صاحبِ علم وقلم کو اس کتاب کا ضرور مطالعہ کرنا چاہیے، تاکہ وہ بول چال اور تحریر و انشا میں مذکورہ غلطیوں سے بچ سکے اور دوسرے کو بھی بچائے۔

حافظ صلاح الدین یوسف

124/40 شاداب کالونی، گڑھی شاہو، لاہور

غلطیہائے عبارت

سال۔ برس:

گردشِ ایام کے بارے میں مہینوں کی متعینہ مدت کو فارسی میں ''سال'' اور اردو، ہندی میں ''برس'' کہا جاتا ہے۔ اردو میں اسماء کی جمع کا طریقہ یہ ہے کہ آخر میں ''وں'' (واوَ اور نون غنہ) لگایا جاتا ہے، مثلاً: برسوں، مہینوں، دوستوں اور دشمنوں وغیرہ۔ کبھی یائے مجہول سے بھی جمع بنتی ہے، مثلاً: مہینے، سفینے، کنارے اور اشارے۔ اور مؤنث کے لیے یائے معروف اور نون غنہ، مثلاً: عورتیں، کتابیں اور حدیثیں وغیرہ، یا الف اور نون غنہ، مثلاً: لکڑیاں اور لڑکیاں وغیرہ۔

مگر زیرِ عنوان موضوع کے سلسلے میں گزارش ہے کہ برس کو برسوں تو ٹھیک اردو کے طریقے سے بنایا جائے گا، مگر سال کو سالوں لکھنے میں ہماری زبان کے ایک مذموم لفظ سے مشابہت کا احتمال ہوتا ہے، اس لیے سال کی جمع ''سال'' ہی کافی ہوتی ہے، مثلاً: پانچ سال یا پچاس سال وغیرہ۔ جب ہم ''دس سالوں'' یا ''پچاس سالوں'' لکھتے ہیں تو عبارت میں ذم کا پہلو موجود رہتا ہے، اس لیے وہاں ''دس سال'' یا ''پچاس سال'' وغیرہ لکھنا چاہیے۔

جب سال یا برس کے ساتھ مدت کا عدد نہ ہو، بلکہ مدت غیر معین ہو تو یوں لکھا جاتا ہے: ''میں نے برسوں کی محنتِ شاقہ سے فلاں کام مکمل کیا ہے۔''

اگر برس کے بجائے آپ نے سال کا لفظ ہی استعمال کرنا ہے تو پھر یوں لکھیے:

''میں نے سالہا سال کی محنتِ شاقہ ... الخ۔''

یہاں ''میں نے سالوں کی محنتِ شاقہ ...'' لکھنے سے عبارت مذموم سی ہو جائے گی، بلکہ شاید کسی کو یہ بھی شک گزرے کہ اس کام میں آپ کے برادرانِ نسبتی بھی شریکِ کار تھے!!

بعض اوقات اس میں ''کئی'' کا لفظ بھی استعمال ہوتا ہے، مثلاً: ''فلاں شخص کئی برس بیرونِ ملک رہ کر آیا ہے۔'' یہاں کئی برس یا کئی سال ہی درست ہے، کئی برسوں (اور کئی سالوں) درست نہیں۔ برصغیر (ہند و پاکستان) میں ''سال'' کی بدلنے والی ہیئتوں میں اس کے مذموم پہلو کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے، خصوصاً جب اِضافت سے ایسا کوئی مرکب بنایا جائے جو کسی شخصیت سے منسوب ہو، مثلاً: ''سالِ فلاں شخص۔'' اس کی جگہ ''فلاں شخص کا سال'' لکھنا موزوں ہوگا، جیسے: اقبال رحمہ اللہ کا سال یا قائداعظم رحمہ اللہ کا سال وغیرہ۔

عربی، فارسی الفاظ:

سال ہی کی طرح بعض اور بھی عربی فارسی الفاظ ہیں جن کا اردو میں دوسرا معنی ہوتا ہے، مثلاً: گنج، کان اور بحر وغیرہ۔ ان کی ترکیبِ اضافی بھی اشخاص کے ساتھ مضحکہ خیز، بلکہ توہین آمیز ہو جاتی ہے۔

ایک واقعہ:

اس سلسلے میں ایک مشہور واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ لکھنؤ میں انیس اور دبیر بڑے بڑے مرثیہ گو شاعر تھے، جن کے پاس شاگردوں کی بھی موج ظفر موج ہوتی

تھی اور یہ دونوں ایک دوسرے کے حریف تھے۔ محرم کے دنوں میں مرثیہ گوئی کے اکثر معرکے ہوتے اور ان دونوں گروہوں کے شاعر نئے نئے مرثیے لکھ کر لاتے اور دوسرے گروہ پر برتری ثابت کرنے لیے بڑی دور کی کوڑی لانے کی کوشش کرتے۔ ایک معرکے میں ایک گروہ کا پہلا شاعر اٹھا اور پہلے مصرعے پر ہی حریف کی چوٹوں کا نشانہ بن گیا ؎

گنجِ علیؓ کے گوہرِ یکتا حسینؓ ہیں

دوسری طرف سے آواز آئی: واہ! واہ! کیا گنجے بنایا ہے!

شاعر جھینپ گیا اور مصرع تبدیل کرتے ہوئے بولا:

کانِ علیؓ کے گوہرِ یکتا حسینؓ ہیں

ادھر سے شور اٹھا: سبحان اللہ! کانے بھی بنا دیا۔

پھر وہ سنبھلا اور مصرع بدلا ؎

بحرِ علیؓ کے گوہرِ یکتا حسینؓ ہیں

اس پر تو پورا مجمع بھڑک اٹھا: ارے بہرے بھی کر دیا!

اس پر استاد نے اصلاح کی اور کہا: ''کنز'' کہو، یعنی ؎

کنزِ علیؓ کے گوہرِ یکتا حسینؓ ہیں

لہٰذا نثر اور نظم دونوں میں ایسی مضحکہ خیز صورتوں سے بچنا چاہیے۔

ایک لطیفہ:

گنج پر ایک لطیفہ یاد آیا۔ علی گڑھ یونیورسٹی میں سالانہ مشاعرے بڑے زور دار ہوتے تھے اور دور دور کے شہروں سے شعرا (اور سامعین بھی) اس میں

شرکت کرتے۔

ایک مرتبہ مولانا ظفر علی خاں مشاعرے کے سیکرٹری تھے، انھیں کسی دوست نے بتایا کہ کاندھلہ سے تین شاعر اکثر آتے ہیں، وہ اپنا کلام تو سناتے ہیں، مگر دوسرے شاعروں کو سنتے وقت ان کے بعض الفاظ پر گرفت کر کے چوٹیں بہت کرتے ہیں، ان کی پہچان یہ ہے کہ وہ سر سے گنجے ہیں۔ ذرا احتیاط رکھیے گا۔ مشاعرے اکثر طرحی ہوتے تھے، اور اتفاق سے اس سال آتش کی غزل کا مصرع تھا ؎

قاروں نے راستے میں لٹایا خزانہ کیا

آتش کی مشہور غزل کا مصرع ہے ؎

سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا
کہتی ہے تجھ کو خلقِ خدا غائبانہ کیا

اسی غزل کا تیسرا شعر ہے ؎

زیرِ زمیں سے آتا ہے جو گل سو زر بکف
قاروں نے راستے میں لٹایا خزانہ کیا

یہ تلمیح ہے، جو آتش نے نہایت خوب صورتی سے اس میں نظم کر دی ہے۔
قاروں کا زمین میں خزانوں سمیت دھنسنا، پھولوں کا زمین سے پیدا ہونا اور ان کے متنوع رنگوں میں سنہری رنگ کی آمیزش، گویا یہ تلمیح صنعتِ حسنِ تعلیل کی بھی نہایت عمدہ مثال ہے۔

اسی شعر کا دوسرا مصرع ''طرحی مصرع'' تھا۔ مشاعرے کا آغاز ہوا تو

مولانا نے پہلے اپنی غزل پیش کی، جس کا دوسرا یا تیسرا شعر تھا ؎

آتا ہے کاندھلے سے جو لاتا ہے سر پہ گنج
قاروں نے راستے میں لٹایا خزانہ کیا

شعر سن کر سارا مجمع زعفران زار بن گیا اور تینوں گنجے شاعر اتنے دبک گئے کہ نہ کوئی چوٹ سوجھی اور نہ کسی پر پھبتی کسی۔ اس طرح گنج نے اردو کا لباس پہن کر نیا رنگ پیدا کر دیا!!

الفاظ کی غلط فہمی:

الفاظ کی غلط فہمی پر ایک اور لطیفہ یاد آ گیا۔ روایت ہمارے ایک دوست (غالباً خالد بزمی) کی ہے کہ مولانا غلام رسول مہر اور عبدالمجید سالک اپنے اخبار کے دفتر سے نکلے اور باہم عربی میں گفتگو کرتے ہوئے سڑک پر آ گئے۔ سامنے ایک تانگے والا کھڑا تھا، اس نے کہا: حضرت! تانگہ لاؤں؟ مولانا مہر نے اپنی عربی گفتگو کے تسلسل ہی میں کہہ دیا: ''لا'' (نہیں) اور آگے چلتے گئے۔

تانگے والا بھی ''لا'' سن کر پیچھے ہو لیا، چند قدم چل کر بولا: ''حضرت بیٹھیے بھی!'' مولانا بولے: بھئی ہمیں تانگہ نہیں چاہیے، وہ بولا تو پھر ''لا'' کیوں کہا؟ دونوں حضرات ہنس دیے اور کہا: بھئی معاف کرنا، ہم عربی کی روانی میں ''لا'' کہہ گئے، معاف کرنا!

مع ۔ بمع (ساتھ):

بعض احباب شادی کارڈوں یا دیگر تقریبات کے دعوت ناموں پر بلانے کے لیے لکھتے ہیں: ''آپ بمع (بلکہ بمعہ) بال بچوں کے تشریف لائیں۔''

یاد رہے کہ ''ب'' حرفِ جار اور مع اسمِ جار ہے۔ یہ دونوں حرف اور اسم عربی ہیں، جو فارسی اور اردو میں بھی مستعمل ہیں، مگر ان کو ایک ساتھ استعمال کرنا غلط ہے۔ اسی طرح ''مع'' کو ''معہ'' لکھنا بھی غلط ہے، لہٰذا مندرجہ بالا جملہ یوں لکھنا چاہیے:

''آپ مع بال بچوں کے تشریف لائیں۔''

درمیان ۔ درمیان میں:

درمیان فارسی لفظ ہے جس کا مطلب ہے: ''بیچ'' یا ''بیچ میں۔''

بعض دوست درمیان کے ساتھ ''میں'' لگا دیتے ہیں، مثلاً: ''ہمارے اور آپ کے درمیان میں فلاں معاملہ طے ہو گیا تھا۔'' حالانکہ لفظ درمیان خود ''در'' اور ''میان'' کا مرکب ہے اور ''در'' کے معنی ہی ''میں'' ہے۔ فارسی میں یہ الگ بھی استعمال ہوتے ہیں اور اکٹھے بھی، مثلاً ؎

درمیانِ قعرِ دریا تختہ بندم کردہ ای
باز می گوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش

اور ؎

میانِ عاشق و معشوق رمزیست
کراماً کاتبین را ہم خبر نیست

اردو شعرا کے ہاں بھی ''میان'' کی مثالیں موجود ہیں ؎

میانِ شاخساراں صحبتِ مرغِ چمن کب تک
(اقبالؔ)

مطمحِ نظر ۔ مطمعِ نظر:

مطمح (م، ط، م، ح) کا مطلب بلند جگہ (یا ''نشانہ'') ہے اور یہ لفظ عموماً نظر کے ساتھ استعمال ہوتا ہے، مثلاً: ''پاکستان میں اسلامی نظام کا نفاذ ہمارا مطمحِ نظر ہے۔'' گویا مطمحِ نظر کا مطلب ہے: ''ہدف''۔

اس لفظ کی املا عموماً مطمع (ع کے ساتھ) دیکھی گئی ہے، جو مطلوبہ مفہوم کے اعتبار سے بالکل غلط ہے۔ معلوم نہیں یہ کتابت یا کمپوزنگ کی غلطی ہوتی ہے یا صاحبِ مضمون کے ذہن میں لفظ ''مطمع'' ہوتا ہے۔ اہلِ قلم کو اس میں احتیاط برتنی چاہیے۔

یہاں ۔ وہاں ۔ یہیں ۔ وہیں:

یہ چاروں الفاظ کسی معلوم مقام کے لیے اشارے کا کام دیتے ہیں، جیسے: یہاں یا وہاں اتنے لوگ آباد ہیں۔ اسی طرح یہیں اور وہیں مستعمل ہے، مگر اس میں خصوصیت کا پہلو ہوتا ہے، جیسے: فلاں واقعہ یہیں (اسی جگہ) یا وہیں (اُسی جگہ) رونما ہوا تھا، مگر ان کے بعد ''پر'' (حرفِ جار) لگانا غلط ہے۔ یعنی ''یہاں

پر" یا "وہاں پر" نہیں لکھنا چاہیے۔ اسی طرح اگر یہاں یا وہاں کے بجائے "اِس" یا "اُس" جگہ لکھنا ہو تو بھی اس کے ساتھ "پر" لکھنا فصاحتِ زبان کے خلاف ہے۔

نہیں۔ نہ:

آج کل بعض لوگ (خصوصاً عدالتی بیان یا کارروائی میں) "نہیں" کے بجائے "نہ" لکھنے لگے ہیں، جو نہایت مضحکہ خیز لگتا ہے، مثلاً: "فلاں عبارت میں جس نکتے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، وہ واقعہ کے مطابق موجود نہ ہے۔" یا "فلاں شخص پر جس جرم کا الزام لگایا گیا ہے، وہ کسی گواہ کے بیان سے ثابت نہ ہے۔"

"نہ" کا یہ استعمال اردو زبان کی سلاست کو مجروح کرنے کے مترادف ہے۔ ایسے جملوں میں لفظ "نہیں" لکھنا چاہیے۔ "نہ" کا استعمال اس وقت ہوتا ہے، جب کسی چیز کی نفی ثابت کرنے کے لیے اس کے ساتھ ایک اور جملہ نفی بڑھایا جائے، مثلاً: وہ طالب علم اتنا غبی (کند ذہن) ہے کہ نہ اسے اردو آتی ہے نہ حساب وغیرہ۔

نثر اور نظم دونوں میں "نہ" کا استعمال اسی انداز سے ہوتا ہے جب ایک سے زیادہ چیزوں (باتوں) کی نفی مطلوب ہو۔ بعض اوقات دو چیزوں کی نفی کے لیے "نہ" کا لفظ ایک مرتبہ بھی استعمال ہو جاتا ہے، مگر حقیقتاً ان میں پہلا جملہ خود نفی کا مفہوم چھپائے ہوئے ہوتا ہے، مثلاً: "آپ نے اگر یہی رویہ اپنائے رکھا تو لوگ آپ کی باتوں کو سچ جانیں گے نہ آپ پر اعتبار کریں گے۔"

یہاں بلاشبہہ "نہ" ایک ہی دفعہ استعمال ہوا ہے، مگر پہلے جملے میں سچ

جاننے کا شبہہ (بصورت نفی) موجود ہے اور "نہ" کا استعمال آخری جملے میں ہوا ہے۔ ایسے اندازِ بیان میں "نہ" آخری جملے میں مستعمل ہوگا۔

اضافت کا بے محل استعمال:

اضافت (زیر) ہمیشہ مرکب الفاظ میں استعمال ہوتی ہے، مثلاً: قابلِ دید، عملِ صالح، رونقِ محفل وغیرہ۔ مگر بعض فارسی مرکبات اسم فاعل ہوتے ہیں، مثلاً: دلربا (دل، ربا) کارآمد، رونق افروز، گل افشاں اور جان آفریں وغیرہ۔ ایسے دو لفظی اسمِ فاعل بھی جب جملے میں مستعمل ہوتے ہیں تو بعض اہلِ قلم ان کو بھی مرکب اضافی بنا دیتے یا پڑھتے ہیں، مثلاً: "وہ زخموں کی تاب نہ لا سکا اور آخر اس نے اپنی جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔"

اس میں "جاں آفریں" (جان پیدا کرنے والی ہستی یعنی اللہ تعالیٰ) کو جانِ آفریں (جانے آفریں) لکھتے یا پڑھتے ہیں، جو سراسر غلط ہے۔ فارسی میں اسمِ فاعل عموماً اسم کے ساتھ فعل امر لگانے سے بنتا ہے (اسمائے نکرہ ومعرفہ کے علاوہ) اس کا اضافت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ گل افشاں کو "گلِ افشاں" گوہر بار کو "گوہرِ بار"، رونق افروز کو "رونقِ افروز" کہنا یا لکھنا غلط ہے۔[1]

---

[1] اسی طرح "دست نگر" کو عام طور پر "دستِ نگر" لکھا اور بولا جاتا ہے، جو غلط ہے، مثلاً: "پاکستان امریکہ کا دست نگر بن کر رہ گیا ہے۔" یہاں "دست" کی ت کے نیچے زیر نہیں پڑھنی چاہیے۔ (نعیم الحق نعیم)

سال ۔ برس:

سال فارسی لفظ اور برس ہندی ہے۔ دونوں بارہ مہینے کی مدت کے لیے مستعمل ہیں۔ ان دونوں کو کسی عدد کے ساتھ واحد، یعنی سال اور برس ہی کہا جائے گا، جیسے ایک سال اور ایک برس۔ چند سال اور چند برس۔ دو، دس، سو، ہزار وغیرہ کے ساتھ بھی سال اور برس ہی لکھنا چاہیے، جیسے: ''پانچ برس یا پانچ سال سے یہ زمین بنجر پڑی ہے۔'' بلکہ غیر معینہ مدت کے لیے بھی کئی سال یا کئی برس ہی کہنا چاہیے۔ ''سالوں'' یا ''برسوں'' میں زبان کے اعتبار سے ذمّ کا پہلو پیدا ہوتا ہے، اس سے پرہیز کرنا چاہیے، البتہ ''سالہا سال'' لکھا جا سکتا ہے۔

مگر یاد رہے کہ برسوں کے بجائے ''برسہا برس'' لکھنا غلط ہے۔ ''ہا'' فارسی میں اسما کی جمع کے لیے آتا ہے۔ ہندی الفاظ کے ساتھ اس کا استعمال اہلِ زبان کے نزدیک غلط ہے۔ علاوہ ازیں عربی ترکیب میں ''عام الحزن'' کا ترجمہ فارسی ترکیب میں ''سالِ غم'' لکھنا بھی مذموم ہے، اس کو اردو ترکیب میں ''غم کا سال'' کہنا چاہیے، اسی طرح شخصیات کے ساتھ سال کی ترکیب، مثلاً: ''سالِ اقبال'' یا ''سالِ قائدِ اعظم'' نازیبا ہے۔

''برائے'' ۔ ''براہ'':

''برائے'' اور ''براہ'' دونوں فارسی الفاظ ہیں۔ برائے کے معنی ہیں: ''کے

لیے'' یا ''کے واسطے'' جب کہ ''براہ'' یہ ''ذریعے سے'' کے معنی دیتا ہے۔ عموماً خطوط یا رقعات میں لکھا جاتا ہے: ''برائے مہربانی خط کا جواب جلد دیں۔'' یا ''برائے مہربانی میری کتاب جلد واپس کر دیں۔''

برائے کا یہ استعمال غلط ہے۔ ایسے معنوں میں ''براہِ مہربانی'' لکھنا یا کہنا چاہیے۔ اس سلسلے میں ''براہِ کرم'' یا ''براہِ نوازش'' بھی استعمال ہو سکتا ہے، مثلاً: ''براہِ کرم مجھے فلاں عبارت کا مفہوم سمجھا دیجیے۔'' یا ''براہِ نوازش مجھے فلاں شعر کا مطلب سمجھا دیجیے۔'' ''برائے'' کا صحیح استعمال یوں ہے:

''مکان برائے فروخت''، ''لائبریری برائے افادۂ عام'' یا ''سامان برائے نیلام'' وغیرہ وغیرہ۔

اہل (والے):

جمع کے لیے استعمال ہوتا ہے: ''اہلِ علم'' (علم والے لوگ)، ''اہلِ شہر'' (شہر کے باشندے)، ''اہلِ وطن'' (وطن کے لوگ) ؎

خوش رہو اہلِ وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

بعض دوست اہل کی جمع ''اہالی'' یا ''اہالیان'' استعمال کرنے لگے ہیں، مثلاً: ''آپ کی تشریف کے منتظر اہالیانِ شہر۔'' اس طرح لکھنا غلط ہے۔ ''اہلِ شہر'' خود جمع کی ترکیب ہے۔

کسی ایک شخص کو اہلِ علم، اہلِ رائے اور اہلِ قلم وغیرہ کہنا یا لکھنا بھی غلط ہے، اس کے لیے صاحبِ علم، صاحبِ رائے، صاحبِ قلم، یا قلم کار کہنا یا لکھنا چاہیے۔

تابع دار:

لفظ تابع (عربی) اسم فاعل ہے۔ یعنی اتباع کرنے والا، مطیع، فرماں بردار

اور محکوم وغیرہ۔ اس کے ساتھ "دار" (فارسی) لگا کر فاعل بنانا صریحاً غلط ہے، ان معنوں میں "فرماں بردار" یا "تابع فرمان" بولنا اور لکھنا چاہیے۔

یہ غلطی عموماً بے خیالی میں سرزد ہو رہی ہے۔ خود میرے ایک شعر میں "تابعدار" ایک عزیز نے دیکھا اور مجھے توجہ دلائی، اس پر میں نے اس کے شکریے کے ساتھ مصرع کی تصحیح کر لی۔

اسی "دار" کے ساتھ اردو ہندی کے بہت سے مرکبات وجود میں آ گئے ہیں، مثلاً: چوکی دار، کرائے دار، چمک دار، سمجھ دار، لچک دار اور کانٹے دار وغیرہ۔ ان میں چوکی دار یا چوکیدار تو غالباً غلط العام ہو کر قبولِ عام حاصل کر گیا ہے اور اہلِ علم نے پاسبان کے معنوں میں اس کا استعمال جائز رکھا ہے، مگر دوسرے الفاظ غلط العام نہیں غلط العوام ہیں، یعنی اہلِ علم نے ان کا جواز تسلیم نہیں کیا۔ لہٰذا اہلِ علم کو ان کے علمی ادبی استعمال سے پرہیز کرنا چاہیے۔

چونکہ۔ کیوں کہ:

یہ جملہ: "میں کل دفتر نہیں آ سکا، چونکہ میں اچانک بیمار ہو گیا تھا۔" غلط ہے۔ اس کو یوں لکھنا چاہیے: "میں کل دفتر نہیں آ سکا، کیوں کہ (کیونکہ) میں ..." یا "چونکہ میں اچانک کل بیمار ہو گیا تھا، اس لیے دفتر نہیں آ سکا۔"

"چونکہ" کا استعمال فقرے کے شروع میں اور "کیوں کہ" کا جملے کے درمیان میں (وجہ لکھنے کے لیے) کرنا چاہیے۔

برخورداری۔ نورچشمی:

آج کل شادی کارڈوں پر لڑکیوں کے لیے برخورداری اور نورچشمی کے

الفاظ بڑی دھوم دھام سے لکھے جاتے ہیں۔ وہ بزعم خویش یہ الفاظ برخوردار اور نورِ چشم کے مؤنث کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ اسی طرح خطوط میں بھی "برخورداری زاہدہ کو پیار" لکھتے ہیں۔ یہ طریقِ تانیث غلط ہے۔ اس سلسلے میں عزیزہ لکھنا چاہیے۔ البتہ "نورِ چشم" مذکر و مؤنث دونوں کے لیے استعمال ہو سکتا ہے۔ برخوردار صرف لڑکے کے لیے استعمال کرنا مناسب ہوگا۔

تاریخِ ولادت اور وفات:

ولادت و وفات کی تاریخ لکھنے کے مندرجہ ذیل طریقے ہیں:

① صرف سال اور مہینا معلوم ہو تو لکھیں: "فلاں صاحب 1921ء میں پیدا یا فوت ہوئے۔" یا "فلاں صاحب نومبر 1875ء میں پیدا یا فوت ہوئے۔"

② اگر تاریخ (یوم) بھی معلوم ہو تو لکھیں: "فلاں صاحب 15 جنوری 1926ء کو پیدا یا فوت ہوئے۔"

مندرجہ بالا جملوں میں خط کشیدہ الفاظ "میں" اور "کو" ہیں جن کے استعمال میں ہمارے بعض اہلِ قلم بے احتیاطی برتتے ہیں اور "1921ء یا 1875ء کو پیدا یا فوت ہوئے" لکھ دیتے ہیں اور یہ غلط ہے، اس کے لیے "میں" کا لفظ اور تاریخ (یوم) معلوم ہونے کی صورت میں "کو" کا لفظ استعمال کرنا چاہیے۔

ولادت و وفات کے علاوہ کسی اور تقریب یا واقعے کی تاریخ لکھنے کا بھی یہی طریقہ ہے، مثلاً: "14 اگست 1947ء کو پاکستان کے پہلے گورنر جنرل نے حلف اٹھایا۔"

ناظمِ اعلیٰ۔ نائب ناظمِ اعلیٰ:

سرکاری محکموں یا پرائیویٹ بڑی تنظیموں میں صدر یا امیر (پریذیڈنٹ یا چیئرمین) کے بعد ناظمِ اعلیٰ (جنرل سیکرٹری) اور نائب ناظم (ڈپٹی سیکرٹری یا اسسٹنٹ سیکرٹری) کے عہدے بھی ہوتے ہیں، مگر آج کل بعض تنظیموں میں ناظمِ اعلیٰ کے بعد نائب ناظم اپنے آپ کو ''نائب ناظمِ اعلیٰ'' لکھتے ہیں، جو اصولی طور پر غلط ہے۔ چیف سیکرٹری (ناظمِ اعلیٰ) کے ساتھ جو شخص اس کے دفتری امور کا پیش کار ہے، اس کو تو ''پی اے ٹو چیف سیکرٹری'' اور ''سٹینو ٹو چیف سیکرٹری'' کہا یا لکھا جاتا ہے، مگر ڈپٹی سیکرٹری اور اسسٹنٹ سیکرٹری اپنے آپ کو ڈپٹی چیف سیکرٹری یا اسسٹنٹ چیف سیکرٹری نہیں لکھتا۔ اسی طرح نائب ناظم بھی ناظمِ اعلیٰ بننے کا امیدوار یا اہل تو ہو سکتا ہے، مگر نائب ناظمِ اعلیٰ کہلانا اصولی طور پر درست نہیں ہے۔

واوِ عطف:

دو اسماء (کلمات) کے درمیان ربط پیدا کرنے والا حرف واوَ ہے، مثلاً:
حسن و جمال، غیظ و غضب اور علم و فضل وغیرہ۔ اردو میں اس کا ترجمہ ''اور'' ہے۔ عربی اور فارسی مرکبات میں ''واوَ'' اور اردو ہندی میں ''اور'' استعمال ہوتا ہے، مگر ان دونوں کا استعمال اپنی اپنی زبان کے مطابق ہونا چاہیے۔

یعنی یا تو دونوں الفاظ عربی ہوں یا دونوں فارسی۔ اردو میں بھی اس کا استعمال ہوتا ہے، مگر اردو کا کوئی لفظ فارسی یا عربی کے لفظ سے معطوف نہیں ہو سکتا، مثلاً: ہم ''قلب و نظر'' (عربی الفاظ) تو کہہ سکتے ہیں، مگر ''قلب و دیدہ'' کہنا درست نہیں ہوگا۔ دیدہ فارسی لفظ ہے، لہٰذا اس ترکیب کو ہمیں ''دل و دیدہ''

یا ''دیدہ و دل'' کہنا ہوگا۔

اسی طرح عربی فارسی الفاظ، اردو ہندی الفاظ کے ساتھ معطوف نہیں ہو سکتے، مثلاً: گل و بلبل تو کہا جا سکتا ہے، مگر پھول و بلبل غلط ہوگا، اسے پھول اور بلبل لکھنا ہوگا، کیوں کہ اردو کا اپنا حرفِ عطف ''اور'' ہے۔

یہ بات بھی اس سلسلے میں قابلِ ذکر ہے کہ الفاظ دونوں یا واحد ہوں یا جمع ہوں۔ ایک واحد اور ایک جمع بھی غلط ہوگا۔

''الاعتصام'' میں ایک مضمون کا عنوان تھا:

''حقوق و ذمہ داریاں''

اس عنوان میں فاضل مضمون نگار نے واوِ عطف کے استعمال میں حقوق (جمع) کے ساتھ ذمے داریاں بھی بطور جمع لکھ دیں، مگر وہ یہ بھول گئے کہ یہ جمع اردو (ہندی) طریقِ جمع ہے، جیسے: الماری سے الماریاں اور دیوار سے دیواریں وغیرہ، اس لیے یہ مرکبِ عاطفہ غلط ہوگیا۔ یہاں یا تو وہ ''حقوق و فرائض'' لکھتے یا ''حقوق اور ذمے داریاں'' لکھنا چاہیے تھا۔

جز بز ہونا:

یعنی افسردہ ہونا، آزردہ ہونا۔ (نور اللغات، جلد دوم، صفحہ: 419) بعض اہلِ قلم اسے ''جُز بُز ہونا'' لکھتے اور بولتے ہیں۔ ''الاعتصام'' شمارہ 43 (10/نومبر 1995ء) میں صفحہ: 19 پر دوسرے کالم سے چھٹی سطر میں ''جُذ بُز'' (ج پر پیش اور حرف دوم ذال، ب پر پیش) لکھا دیکھا۔ یاد رہے کہ فارسی میں دونوں الفاظ پر پیش ہوتو ''جُز'' کے معنی حصہ یا سوائے اور علاوہ کے ہیں۔ حصہ کے معنوں میں عربی کے جزو کی واؤ گرا کر اُردو بنا لیا گیا ہے، اگرچہ نثر و نظم میں ''سوائے'' اور ''علاوہ'' کے معنوں میں ''جز'' بھی مستعمل ہے۔ غالب کا شعر ہے ؎

جُز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار
صحرا مگر بہ تنگیِ چشمِ حسود تھا

نثر میں کتاب کی سلائی کو ''جُز بندی'' اور ذہین یا کنجوس آدمی کے لیے ''جُز رس'' لکھا اور بولا جاتا ہے۔ ''بُز'' کے معنی بکری (شاۃ) کے ہیں۔ ڈرپوک شخص کو بھی ''بزدل'' کہا جاتا ہے۔

سوم وار۔ پیر:

ہمارے ملک کے مسلمانوں میں یہ عقیدہ رواج پا چکا ہے کہ دنوں کے نام

جو ہندوؤں نے رکھے ہیں، ان میں حتی الامکان تبدیلی کر کے اسلامی قسم کے نام رکھ لیے جائیں، لہٰذا شنی وار، شکر وار، سنیچر وار کو جمعرات، جمعہ، ہفتہ سے بدل لیا گیا ہے، مگر ایتوار (اتوار)، سوموار، منگل وار، بدھ وار میں سے صرف سوموار کو پیر کہا جانے لگا ہے۔ اس کی اصل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا یومِ پیدائش سوموار تھا، لہٰذا اس کو پیر (آنحضرت ﷺ) سے نسبت دی گئی۔

ہمارے بعض احباب جو پیر کو عام پیری مریدی کرنے والے لوگوں کی نسبت سمجھتے ہیں، اس لیے پیر کہنے سے پرہیز کرتے ہیں اور سوموار ہی لکھتے اور بولتے ہیں، حالانکہ سوم ہندی میں چاند کو کہتے ہیں۔ جسے ہندو لوگ دیوتا سمجھتے ہیں، لہٰذا اس کے نام سے یہ دن منسوب ہے۔ کاٹھیا واڑ (گجرات) میں سومنات کا مندر ہے، جسے محمود غزنوی نے پاش پاش کر دیا تھا۔ سوم بہ معنی چاند اور نات (ناتھ) بہ معنی مالک یا خداوند۔ اس وجہ سے ایک بت کے نام کی نسبت والے دن کو بدل کر پیر کر لیا جائے تو کوئی حرج کی بات معلوم نہیں ہوتی۔

ایک دلچسپ حکایت:

اس پر ایک دلچسپ حکایت یاد آ گئی۔ محمود غزنوی نے جب سومنات پر حملہ کیا تو اس کے لشکر کے ساتھ اس کا درباری شاعر فرخی سیستانی بھی تھا (محمود کے دربار میں کئی ایک شاعر تھے، جن میں عنصری، عسجدی، فرخی اور فردوسی معروف ہیں۔ فردوسی شاہنامہ لکھنے پر مامور تھا، جب کہ دوسرے شعرا مختلف تقاریب پر قصائد کہتے تھے) فرخی نے سومنات کی مہم پر ایک طویل قصیدہ لکھا۔ مولانا شبلی نے ''شعر العجم'' میں فرخی کے ذکر میں صرف اس کی واقعہ نگاری

کے محاسن بیان کیے ہیں، مگر اس قصیدے میں سومنات پر محمود کی تاخت و تاراج کی تاریخی حیثیت بھی ہے اور سومنات کے مندر کی تفصیلات بھی بڑی چابک دستی سے بیان کی گئی ہیں، مگر اس میں اس نے خود رائی اور تاریخ سازی سے بھی کام لیا ہے۔

وہ کہتا ہے کہ اس بت کا نام ''منات'' تھا، جو ہندو لوگ کعبہ سے چرا کر لائے تھے اور اس کے متعلق مشہور کیا گیا تھا کہ یہ سمندر سے نکلا ہے۔ اس کا نام سومنات رکھ دیا گیا۔ بعض ان میں سے یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ خود آسمان سے اترا تھا اور پوری کائنات اس کے حکم سے چلتی ہے۔ اس قصیدے میں یہ ستم ظریفی بھی ہے کہ محمود اس بت کو کھود کر مکہ لے جانا چاہتا تھا، مگر جب اس کو اکھاڑا گیا تو اس میں سے بے حساب مال و دولت نکلا، لہٰذا اسے محمود نے اپنے ہاتھ سے توڑا اور بت کدے کو جلا ڈالا اور مال و زر پر قبضہ کر لیا۔

یہ واقعہ پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ محمود نے فرخی کو اس قصیدے پر انعام سے سرفراز کیا، مگر اس سے یہ نہ پوچھا کہ تم نے یہ کیا بکا ہے؟!

فرخی یہ بھی کہتا ہے کہ سلطان کی دو خواہشیں تھیں: ایک یہ کہ ہندوؤں کے مقامِ حج کو غارت کرے گا اور دوسری یہ کہ وہ اس سے فارغ ہو کر خود خانۂ خدا کا حج کرنے جائے گا۔ اس کی پہلی خواہش تو پوری ہوگئی، مگر دوسری کا موقع نہ مل سکا۔

یہ قصیدہ رائیہ ہے جو 175 شعروں پر مشتمل ہے۔ (دیوانِ فرخی سیستانی مطبوعہ 1936ء)

اختتام:

کسی جگہ ایک مصرع تھا، جس کی نثری عبارت یوں بنتی ہے: ''زندگی کی مہلت اختتام ہوگئی۔'' لفظ اختتام کا استعمال اردو میں ''کا'' یا ''کے'' کے ساتھ مرکب ہوتا ہے، مثلاً: ''اجلاس کا اختتام شام کو ہوا۔'' یا ''اجلاس کے اختتام پر چائے نوشی کا دور چلا۔'' یا ''بحث اتنی طویل ہوگئی کہ مقررہ وقت میں اس کے اختتام کی امید نہیں تھی۔''

''مقررہ مدت اختتام ہوگئی۔'' کہنا یا لکھنا غلط ہے۔ ختم ہوگئی یا تمام ہوگئی کہنا چاہیے۔ نیز اختتام کا لفظ عموماً مدت یا مساحت کے لیے استعمال ہوتا ہے، مگر کسی چیز کی مقدار کے لیے مناسب نہیں، اس کے لیے ختم ہونا یا تمام ہونا درست ہوگا، جب کہ یہ دونوں لفظ مدت یا مساحت کے لیے بھی استعمال ہوتے ہیں، مثلاً:

① فلاں شخص کو کام ختم کرنے کے لیے دو ماہ کی مہلت دی گئی تھی، مگر وہ اس کے اختتام تک کام مکمل نہ کر سکا۔

② ایک جگہ پانچ میل سڑک بنانے کا ٹھیکا تھا، مگر انھوں نے تین میل پر ہی اس کا اختتام کر دیا اور کام ادھورا چھوڑ گئے۔

ان دونوں جملوں میں ختم اور تمام کے الفاظ بھی جملے کی ساخت کی معمولی تبدیلی سے استعمال ہو سکتے ہیں۔

شیوا۔ شیوہ:

شیوا۔ فارسی (مذکر) فصیح و بلیغ۔ جو خطیب، شاعر، معلم یا کوئی فاضل شخص نہایت فصاحت و بلاغت سے اپنا مافی الضمیر بیان کرے، اس کو شیوا بیان یا شیوا زبان کہا جاتا ہے ؂

مہرِ خاموشی لبوں پر کیوں ہے، فرمائیں جناب
ہم تو سنتے تھے بہت شیوا بیانی آپ کی

شیوہ: انداز، طریقہ، عادت (مذکر) ''منہ پر سچی بات کہنا آں مرحوم کا شیوہ تھا'' ؂

وعدہ کر کے آپ فرماتے ہیں میں نے کیا کہا؟
یوں مکر جانا تو پہلے آپ کا شیوہ نہ تھا

بعض حضرات ان باہم متشابہ الفاظ کی اِملا کو گڈ مڈ کر دیتے ہیں، متذکرہ مفہوم کے مطابق ان کو اِملا کرنا چاہیے۔

ہائے ہوّز (ہ):

یہ اردو حروفِ تہجی کا ایک مستقل حرف ہے۔ اس کی تین قسمیں ہیں:

① پہلی ہائے ملفوظ ہے، جس میں اس کی باقاعدہ الگ آواز ہوتی ہے، جیسے:

ہوا، بہت، واہ وغیرہ۔

② دوسری ہائے مخلوط ہے، جو اردو ہندی کے بعض حروف کا جزو ہوتی ہے۔ اس کی الگ آواز نہیں ہوتی، بلکہ یہ متعلقہ حرف کی آواز کو بھاری بناتی ہے، جیسے یہی لفظ ''بھاری'' ہے۔ اس میں ہائے مخلوط ''ب'' کا جز ہے۔ یہ چار حرفی لفظ ہے۔ اگر اس کی ''ہ'' کو الگ کر کے لکھیں تو وہ ''بہاری'' ہوگا اور پانچ حرفی لفظ ہوگا جس کا معنی بھی الگ ہے۔ یہ صرف اردو اور ہندی کے الفاظ میں پائی جاتی ہے، جیسے: بھائی، پھول، تھالی، تھیلا، جھوٹ، چھتری، دھوبی، ڈھول، کھیت اور گھی وغیرہ۔ اس کو دوچشمی (دو آنکھ والی) ''ھا'' کہا جاتا ہے۔

بعض احباب اس کے لکھنے میں بے احتیاطی کرتے ہیں، مثلاً: ''لکڑی کو گھن لگ گیا ہے'' وہ گھن کو گہن لکھ دیتے ہیں، حالانکہ اس املا والے لفظ کو ''گہن'' کہتے ہیں جس کے پہلے دونوں حروف بالفتح (زبر کے ساتھ) ہوتے ہیں، بروزن چمن، اور یہ چاند یا سورج کے مکمل یا نامکمل اندھیرے میں چھپ جانے کو کہتے ہیں۔ یہ ہندی لفظ ہے جس کو گرہن بھی کہتے ہیں اور عربی میں اسے کسوف اور خسوف بولتے ہیں۔ اس لیے گھن کو گہن لکھنا غلط ہے۔ اسی طرح مہک (خوشبو) کو ''مھک'' لکھ دینا بھی غلط ہوگا۔

ہندی میں بعض الفاظ ل، م، ن کے ساتھ ہائے مخلوط لگے ہوئے ملتے ہیں، جیسے ملھار (راگ)، منھار (گدھوں پر باربرداری کرنے والا)، منھیار (کانچ کی چوڑیاں بنانے والا) وغیرہ۔

عربی، فارسی عبارات میں بھی ہائے مخلوط (دوچشمی) بطور ہائے ملفوظ اکثر دیکھنے میں آتی ہے، جیسے: ھما (فارسی میں ایک نادیدہ پرندہ) اور "ھُوَ" اور "ھُمْ" وغیرہ عربی میں ضمیر غائب (وہ) وغیرہ۔ مگر یہاں قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ عربی میں ہائے مخلوط کے باعث لفظ کے معانی میں کسی تشابہ کا امکان کم ہی ہے، [1] لیکن فارسی کے بے شمار الفاظ اردو میں بھی مستعمل ہیں، ان میں ہائے ملفوظ کو اگر ہائے مخلوط (دوچشمی) سے لکھا جائے تو معانی میں یقیناً فرق پڑتا ہے، مثلاً: بہتر کو "بھتر" لکھ دیں تو وہ یا تو مہمل کہلائے گا یا ہندی کے لفظ بھیتر (اندر) کا شبہہ ہوگا کہ املا غلط ہوگئی ہوگی۔ لفظ "پہلو" کو ہائے مخلوط سے لکھ کر دیکھیں اور پھر ہنسی روکنے کی لاکھ کوشش کریں، کامیاب نہ ہوں گے۔

ہمارے عربی دان اہلِ قلم کو بھی ان خطرات کا احساس رہنا چاہیے کہ اگر کوئی لفظ ایسا نکل آئے جو ہندی اور اردو لفظ کا ہم شکل ہو تو اس کی املا ہائے مخلوط کے بجائے ہائے ملفوظ سے کرنی چاہیے، مثلاً: دَہن (دولت) یا دُھن (شدید جذبہ یا راگ کے الاپ) کا شبہہ ہوگا۔ اردو املا کو اردو قواعد و معانی کے لحاظ سے لکھنا چاہیے۔

او۔ٹی ٹیچر:

ہمارے عربی مدارس سے فارغ التحصیل نوجوان آج کل سکولوں میں عربی ٹیچر کی اسامیوں پر ملازم ہیں، ان میں سے بعض ٹیچر انگریزی نہ جاننے کے

[1] عربی میں ہائے مخلوط کا سرے سے وجود ہی نہیں ہے۔ عربی میں "ہا" جس طرح بھی لکھی جائے، وہ ہائے ملفوظ ہی ہوتی ہے۔ (نعیم الحق نعیم)

باعث اپنے نام کے ساتھ او۔ ٹی ٹیچر بطورِ عہدہ لکھتے ہیں۔ [1]

دراصل مشرقی زبانوں کو انگریزی میں اوری اینٹل لینگوئجز (Oriental Languages) اور ان کے معلم کو اوری اینٹل ٹیچر کہتے ہیں۔ انگریزی میں الفاظ کی تخفیف کے لیے ان الفاظ کا پہلا حرف لکھنے کا رواج ہے، لہٰذا متذکرہ ٹیچروں کو او۔ ٹی (O.T) لکھا جاتا ہے، جس میں صرف T ٹیچر کا مخفف ہے۔ تحریر ہذا کا مقصد یہ ہے کہ او۔ ٹی کے بعد ٹیچر لکھنے کی ضرورت نہیں، ورنہ اس کی صورت وہی ہوگی جو ان جملوں میں ہے: "شالا مار باغ دیکھنے کے قابلِ دید ہے۔" یا "موسیٰ علیہ السلام کو کوہِ طور پہاڑ پر روشنی نظر آئی۔"

والا۔ والہ:

"والا" فارسی لفظ ہے جو بلند مرتبہ اور بزرگ شخصیت کے لیے مستعمل ہے، اس کا لغوی معنی بلند اور بزرگ ہے۔ کسی کے لیے معزز القاب یوں استعمال ہوتے ہیں: والا جاہ، والا مقام، والا مرتبت اور والا شان وغیرہ۔ "والا" کا لفظ مخاطب کی شان و مرتبے کے لفظ سے پہلے استعمال ہوتا ہے، لیکن بعض اوقات کسی شخص کے صفاتی نام کے بعد بھی استعمال ہوتا ہے، جیسے: سید والا اور مرشد والا وغیرہ، اگرچہ ایسی صورت میں بھی والا کے بعد شان، مرتبت، مقام وغیرہ لگانا چاہیے، تاکہ مزید عظمت کا اظہار ہو، جیسے سیدِ والا شان، مرشدِ والا مقام وغیرہ۔ لیکن ایسا نہ ہو سکے تو بھی درست ہوگا۔

[1] آج کل او۔ ٹی (اوری اینٹل ٹیچر) کے بجائے اے۔ ٹی (عریبک ٹیچر) یا پی۔ ٹی (پرشین ٹیچر) کی اصطلاحات استعمال ہوتی ہیں۔ (فارانی)

اردو میں والا کسی سے تعلق یا ملکیت کے لیے استعمال ہوتا ہے، جیسے: دودھ والا، گھر والا اور دکان والا وغیرہ۔ نسبت کے لیے اللہ والا۔ شہروں یا گاؤں کے ناموں میں ان کے بانیوں سے نسبت کے لیے، مثلاً: گوجرانوالا اور بوڑے والا وغیرہ۔ اسم فاعل کے طور پر (مصدر کے اِمالے کے ساتھ) کھانے والا، پینے والا، دیکھنے والا اور سننے والا وغیرہ۔

''والِہ''، لام کی زیر اور ہائے ملفوظ کے ساتھ، لغوی معنی فریفتہ، شیفتہ، شدید محبت کرنا وغیرہ، مگر اس کو مفرد استعمال نہیں کرتے، بلکہ اس کے ساتھ ''شیدا'' کا اضافہ کرتے ہیں: ''وہ اپنے استاد کا والہ وشیدا ہے۔''

متذکرہ تفصیل کا مقصد یہ ہے کہ والا اور والِہ کی معنویت کو عبارت میں ملحوظ رکھا جائے اور اس کے مطابق اِملا کی جائے۔ ①

حامی۔ ہامی:

یہ دونوں الفاظ بہ ظاہر ہم آواز ہیں، مگر معناً مختلف ہیں۔ حامی (حائے حطی) کے معنی ہیں: حمایت کرنے والا، ساتھ دینے والا، تائید کرنے والا، مثلاً: ''میں اس معاملے میں آپ کا حامی ہوں۔'' یہ عربی لفظ ہے اور قواعد کی رو سے فاعل ہے۔

ہامی (ہائے ہوز) اردو لفظ ہے۔ یہ بھی تائید کرنے کے معنی ہی میں استعمال کرتے ہیں، مگر اس کو ہامی ہونا نہیں، بلکہ ہامی بھرنا لکھا جاتا ہے۔ ''میں کسی غلط گو کی ہامی نہیں بھر سکتا۔'' بعض محققین نے اسے ''ہاں مَیں'' کا مخفف

① شہروں کے نام گوجرانوالہ، عارفوالہ، کبیر والہ وغیرہ لکھنا غلط ہے۔ ان کی درست شکلیں گوجرانوالا، عارفوالا، کبیر والا وغیرہ ہیں۔ (فارانی)

بتایا ہے، یعنی میں اقرار کرتا ہوں۔ قواعد کی رو سے بھی ''حامی'' اسم فاعل ہے تو ''ہامی'' صرف اسم ہے، اس طرح ان کا استعمال یوں ہوگا: حامی ہونا۔ ہامی بھرنا۔

درخواست۔ برخاست:

درخواست فارسی مصدر خواستن سے بنا ہے، جس کے معنی چاہنا یا مانگنا ہے۔ قواعد کی رو سے درخواست فعل ماضی ہے۔ خواستن اور خواست میں واؤ معدولہ ہے، جو لکھنے میں آتی ہے، بولنے میں نہیں آتی۔ اردو میں درخواست کو بطور اسم استعمال کیا جاتا ہے اور جملے میں اسے مؤنث بولتے اور لکھتے ہیں: ''میری درخواست ہے۔''، ''آپ کی درخواست منظور ہوگئی ہے۔'' وغیرہ۔

فارسی میں ایسے اور بھی الفاظ ہیں جن میں واؤ معدولہ لکھی جاتی ہے، مگر بولی نہیں جاتی، مثلاً: خود، خوش، خورد (کھایا) خویش (اپنے، اپنا، اپنی) خواہش، خواب وغیرہ۔ ان کا تلفظ خُد، خُش، خُرد، خیش، خاہش، خاب ہے۔ یاد رہے کہ اس واؤ کے نیچے زیر (بصورت ڈیش، یعنی چھوٹا سا خط) ضرور لگایا جائے۔ واؤ معدولہ ہمیشہ خ والے لفظ میں ہوتی ہے اور اس کو اردو میں بھی بعینہٖ قبول کیا گیا ہے۔

درخواست ہی کا ہم آہنگ لفظ برخاست ہے۔ یہ فارسی مصدر خاستن (اُٹھنا یا کھڑا ہونا) سے فعل ماضی خاست ہے، جس کے معنی ''اٹھا'' یا ''کھڑا'' ہے، مثلاً: شورِ محشر برخاست (محشر کا شور برپا ہوگیا یا اٹھ کھڑا ہوا) ے

نشستند و گفتند و برخاستند

''بیٹھے اور گفتگو کی اور اٹھ کھڑے ہوئے۔''

ہمارے دوست اس کو بھی درخواست کے قیاس پر برخواست لکھ دیتے

ہیں: ''محفل برخواست ہوگئی۔'' یہ سراسر غلط ہے، اس کو ''برخاست'' لکھنا چاہیے، جیسے: ''فلاں شخص کو نوکری سے برخاست کر دیا گیا۔'' یعنی نکال دیا گیا۔

یاد آیا کہ واوٴ معدولہ والے (متذکرہ بالا) الفاظ میں ''خود'' کا ہم آواز لفظ ''خرد'' بھی ہے، جس کا معنی چھوٹا (بزرگ کی ضِد) ہے۔ برادرِ گرامی اسحاق بھٹی صاحب نے اپنے ایک مضمون میں ان کا فرق واضح کر دیا ہے۔ (الاعتصام جلد 47 شمارہ 13، صفحہ: 357) اس پر مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں، البتہ یہ یاد رہے کہ خورد (واوٴ معدولہ کے ساتھ) فارسی کے مصدر خوردن (کھانا) کا فعل ماضی ہے، یعنی کھایا، جب کہ خُرد ایک مکمل اسم (اسمِ صفت) جو بزرگ کی ضد، یعنی چھوٹا کے معنوں میں مستعمل ہے۔ نیز بعض مرکبات میں بھی اس کو استعمال کیا جاتا ہے، جس میں ''ہ'' کا اضافہ کیا گیا ہے، جیسے: خردہ گیری (نکتہ چینی، عیب جوئی) خردہ کے معنی ہیں: ریزہ، ٹکڑا، چھوٹی چھوٹی چیز۔ اس کے ساتھ اور بھی مرکبات وضع کر لیے گئے ہیں، مثلاً: خُردہ فروش، خردبین۔ اس کو ''خردہ بین'' بھی کہا جاتا ہے ؎

عیب جُو خردہ بیں کا یہ احوال
دوپہر کو فلک نہ آئے نظر
(مومنؔ)

خُردبین مرکب فاعل ہے، مگر یہ ایک آلے کو بھی کہا جاتا ہے جس میں باریک چیز دیکھنے کے لیے شیشے لگے ہوتے ہیں، جو اس چیز کو بڑا کر کے دکھاتے ہیں (یہ جراثیم وغیرہ کو دیکھنے کے کام آتی ہے) اس کو ''خوردبین'' لکھنا غلط ہے،

املا میں واوٴ معدولہ نہیں آنا چاہیے۔

اس سلسلے میں دلچسپ ترکیب یہ بھی ہے کہ بوڑھے آدمی کو سال خورد اور چھوٹی عمر کے لڑکے کو ''خُرد سال'' کہا جاتا ہے۔ دونوں کی املا اور سیاق وسباق ملحوظ رہے۔

خط و کتابت۔ خط کتابت:

خط اور کتابت بنیادی طور پر دونوں عربی الفاظ ہیں۔ اردو میں یہ دونوں ''مراسلت'' کے معنوں میں استعمال ہو رہے ہیں، مگر ان میں واوٴ عطف ڈال کر لکھنے کا رواج ہو گیا ہے، یعنی دو اشخاص کا آپس میں ایک دوسرے کو خط لکھنا ''خط و کتابت'' کہلاتا ہے، اس طرح یہ مرکب عاطفہ بن گیا ہے، جو ان معنوں میں غلط العوام اور اردو عبارت میں اسے (بے خیالی میں) قبول کر لیا گیا ہے۔

حالانکہ خط کے معنی بھی تحریر ہے اور کتابت کے معنی بھی تحریر ہے، مگر ''خط'' کو چٹھی (مراسلہ) کے معنوں میں بھی استعمال کرتے ہیں، جیسے: ''آج میں نے بھائی صاحب کو خط لکھا'' یا ''آج بھائی صاحب کا خط آیا ہے کہ میں جلد واپس آ رہا ہوں'' وغیرہ۔

خط انگریزی میں ان معنوں میں لیٹر (Letter) کہلاتا ہے، خواہ وہ پوسٹ کارڈ کی شکل میں ہو، خواہ لفافے میں بند کاغذ پر لمبی تحریر ہو، مگر ہمارے ہاں کھلے اور دبیز کاغذ پر لکھا گیا ہو تو خط کہلاتا ہے اور لفافے میں بند تحریر کو چٹھی کہتے ہیں، کھلے خط یعنی پوسٹ کارڈ پر ڈاک ٹکٹ بھی کم مالیت کا ہوتا ہے اور اس پر تحریر بھی مختصر ہوتی ہے۔ (وقت کے ساتھ ساتھ پوسٹ کارڈ معدوم ہو گئے ہیں)

اوپر بیان کی گئی صورتِ حال کے مطابق ''خط و کتابت'' کہنا درست

نہیں، بلکہ اسے ''خط کتابت'' (بغیر واؤ) کے لکھنا چاہیے، اس طرح اس کا مفہوم ''خط لکھنا'' (مراسلت کرنا) درست ہو گا۔ اس کی مثال نور اللغات (جلد2، صفحہ:665) میں موجود ہے، مگر وہاں کتابت کی غلطی سے واؤ بھی لکھا گیا ہے، وہ غلطی اس طرح معلوم ہوئی کہ وہاں یہ شعر بھی مثال میں درج ہے ؎

خط و کتابت ہوئی موقوف کہ اب خط آیا
فی الحقیقت وہ لکھیں گے کسی صورت نامہ
(سحر)

اس میں ''خط و کتابت'' کے مرکب لانے سے مصرع بحر سے خارج ہو جاتا ہے، لہٰذا ظاہر ہے کہ یہ ''خط کتابت'' ہے، ''خط و کتابت'' نہیں۔ نور اللغات کا یہ 1985ء کا اڈیشن ہے اور کتابت کی اس غلطی کو نظر انداز کیا گیا ہے جو یقیناً سہوِ نظر ہے، نیز اس کے دائیں طرف خط کشیدہ عنوان میں بھی خط اور کتابت کے درمیان جگہ نہیں تھی، مگر معلوم ہوتا ہے کاتب نے دونوں کے درمیان واؤ کو بعد میں داخل کیا، اور پروف ریڈر (کتابت کی تصحیح کرنے والے) سے بھی چوک ہوئی ہے۔[1]

شروع:

شروع کے لغوی معنی ''کسی کام میں پڑنا'' ہے۔ اس کو ابتدا یا آغاز کے معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے اور اس کے ساتھ ''کرنا'' یا ''ہونا'' بطور امدادی

[1] اس سلسلے میں میر تقی میر کا ایک شعر بھی سند ہے:
خط کتابت سے یہ کہتے تھے نہ بھولیں گے تجھے
آویں گے گھر بار تیرے کی خبر کو بار بار

فعل لگتا ہے، جیسے ''مسجد کی تعمیر شروع ہو گئی ہے۔'' ہونا کے ساتھ اس کی معنوی صورت ہوتی ہے، جب کہ فاعل کے لیے اس کے ساتھ کرنا، کیا، کیا گیا، کیا جائے، کرو، کریں وغیرہ جیسے امدادی افعال استعمال ہوں گے، جیسے ''میں نے کتاب پڑھنی شروع کر دی ہے'' وغیرہ۔

شروع کا تعلق اس کام سے ہے جو کرنے کا ہے، لیکن اس شخص سے نہیں جو کرنے والا ہے، جیسے اوپر کی مثالوں میں مسجد کی تعمیر اور کتاب پڑھنا کے ساتھ شروع کا لفظ متعلق ہے۔ کسی شخص کے لیے جب ہم کہیں گے کہ ''وہ آدمی بولنا شروع ہو گیا۔'' یا ''وہ دفتر جانا شروع ہو گیا۔'' تو یہ عبارت غلط ہو گی، اس کے لیے یوں کہنا یا لکھنا چاہیے: ''وہ آدمی بولنے لگا، یا اس آدمی نے بولنا شروع کر دیا'' اسی طرح ''وہ دفتر جانے لگا یا اس نے دفتر جانا شروع کر دیا''۔

گاہے گاہے:

فارسی لفظ گاہ یا گاہے کی تکرار بہ معنی کبھی کبھی ؎

ایک مدت سے نہیں پہلا تعلق حافظ
آج کل ان سے ملاقات ہے گاہے گاہے

فارسی کا مشہور شعر ہے ؎

تازہ خواہی داشتن گر داغ ہائے سینہ را
گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را

بعض دوست گاہے گاہے کو ''گاہے بگاہے'' لکھتے ہیں، جو صریحاً غلط ہے، شاید اس کی وجہ ''جابجا'' کی ترکیب پر قیاس ہے، حالانکہ وہ جگہ جگہ کے معنوں

میں فارسی ب کے ساتھ مستعمل ہے۔ جابجا ظرفِ مکان ہے اور گاہے گاہے
ظرفِ زمان، دونوں کے قواعد الگ الگ ہیں۔

گاہے گاہے کو گاہ گاہ بھی لکھا جاتا ہے جو ضرورتِ شعری کے لیے ہوتا ہے، نیز ''گاہ'' (تنہا) جگہ کے معنوں میں مرکبات میں بھی آتا ہے، مثلاً: چراگاہ، آرام گاہ، سیر گاہ وغیرہ۔ شعر میں ''گاہ'' (کبھی) کا الف گرا کر ''گہ'' بھی لکھا جاتا ہے، یہ بھی ضرورتِ شعری کا تقاضا ہوتا ہے۔ اس کی ایک صورت ناگاہ بھی ہے، جو اچانک کے معنوں میں مستعمل ہے، اس سے ناگہاں اور ناگہانی جیسے الفاظ بھی وجود میں آئے ہیں جو حادثاتی واقعے کے لیے بولے جاتے ہیں۔

غیظ:

غیظ کی املا ''ظ'' کے بجائے ''ض'' سے کرنے کا معلوم نہیں کس نے آغاز کیا ہے کہ اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگ اس غلطی میں مبتلا ہیں۔ ہمارے ایک معاصر نے ایک مضمون کا عنوان جلی حروف سے شائع کر دیا ہے، معلوم نہیں یہ اجتہاد ہے یا سہوِ نظر!!

غیظ وغضب کو لوگ ''غیض وغضب'' لکھ دیتے ہیں جو کسی طور درست نہیں۔

ہُنُوز:

یہ فارسی لفظ ہے، جس کے معنی ''ابھی تک'' ہیں۔ بعض دوست اس کے ساتھ ''تا'' (تک) بھی لکھتے ہیں: ''آپ نے تاہنوز میرا کام نہیں کیا۔'' اس کے ساتھ ''تا'' لگانے کی ضرورت نہیں، کیوں کہ تا کا مفہوم ہنوز میں پہلے سے موجود ہے۔

کافی:

یہ کسی چیز کے لیے کفایت کی فاعلی صورت ہے، یعنی کفایت کرنے والا، جس کے بعد آدمی کو مزید حاجت نہ رہے، مثلاً: ''یہ رقم آپ کے مہینے بھر کے خرچ کے لیے کافی ہوگی۔''

یہ لفظ پسندیدہ معنوں میں استعمال ہونا چاہیے۔ مثلاً: ''ہمارے لیے اللہ کافی ہے۔''، ''مکان کی حفاظت کے لیے ایک آدمی کافی ہوگا۔'' لیکن ناپسندیدہ حالتوں میں اس کا استعمال غلط ہوتا ہے، مثلاً: ''آج اسلم کو کافی بخار رہا۔'' ایسی صورت میں یوں کہنا چاہیے: ''آج اسلم کو بہت بخار رہا'' یا ''خاصا بخار رہا۔'' یہ لکھنا: ''فروٹ کی تجارت میں ہم نے کافی نقصان اٹھایا۔'' غلط ہے، اس کی جگہ ''بہت'' یا ''خاصا'' وغیرہ کا لفظ لانا چاہیے۔ البتہ فائدے کی صورت میں کافی کا لفظ موزوں ہوگا، کیوں کہ کافی کا مفہوم کسی چیز کا بقدرِ ضرورت ہونا ہے، لیکن بیماری یا تکلیف کی کسی کو ضرورت نہیں ہوتی۔

پنجابی الفاظ کی اردو املا:

پنجابی زبان کے الفاظ مخصوص لب ولہجہ رکھتے ہیں، جن کی اردو املا میں ہمارے اہلِ قلم اکثر غلطی کرتے ہیں۔ یہ غلطی عموماً ان الفاظ میں ہوتی ہے جو بعض حروفِ تہجی کے ساتھ ہائے مخلوط (ھ) سے بنتے ہیں، مثلاً: ب، ج، د، ڈ اور گ سے بننے والے الفاظ کے ساتھ ہائے مخلوط لگنے سے پنجابی لہجہ اردو سے قدرے مختلف تو ہے، مگر املا میں غلطی عموماً سرزد نہیں ہوتی، مثلاً: دھوتی، دھول، دھوم، دھوبی وغیرہ۔ اسی طرح ڈھول، ڈھکنا وغیرہ، گھنٹا، گھڑیاں، گھڑی وغیرہ، مگر ''ب'' اور ''ج'' کے ساتھ ہائے مخلوط سے بننے والے الفاظ میں خاصی بے احتیاطی، بلکہ بے طرفگی پائی جاتی ہے۔ درج ذیل مثالوں پر غور فرمانے کی ضرورت ہے:

① ب کے ساتھ ہائے مخلوط سے بننے والے الفاظ:

بھائی: اس کو غیر پنجابی ''پائی'' کہے گا۔ جب کسی شخص کو احتراماً ''بھا جی'' کہا جائے گا تو اس میں پنجابی لہجہ ''پا'' کے بہت قریب ہوگا، اس لیے ''پا جی'' جیسے مذموم لفظ سے بچنے کے لیے اس کی املا ''بھا جی'' ہی ہونی چاہیے۔ یہی صورت بھائی، بھولا، بھنڈی، بھاگ (نصیب)، بھانڈا، بھونڈ اور بھین وغیرہ کی ہے، ان کو پائی، پولا، پنڈی، پاگ، پانڈا، پونڈ اور پین نہیں لکھنا چاہیے۔

② ج کے ساتھ ہائے مخلوط والے الفاظ:

جھنڈا کو چنڈا، جھولی کو چولی، جھالر کو چالر، جھوٹ کو چوٹ، جھانجر کو چانجر نہیں لکھا جائے گا۔ ایک مخصوص پنجابی لفظ ''جھونگا'' ہے، اس کے مخصوص لہجے کی وجہ سے اسے چونگا، چوہنگا، چونگہا یا چھونگا وغیرہ لکھ دیا جاتا ہے، اس کی املا بھی ''جھونگا'' ہی ہونی چاہیے۔ (جھونگا وہ انعامی اضافہ ہوتا ہے جو دکاندار بچوں کو اصل سودے کے ساتھ ایک آدھ ریوڑی یا ٹافی وغیرہ کی صورت میں اس لیے دیتے ہیں کہ وہ خوش ہو کر اسی کی دکان سے سودا لینے آتا رہے)۔

انگریزی الفاظ کا بے جا استعمال:

اہلِ قلم اپنی عبارات میں انگریزی الفاظ کا استعمال اس جگہ کرتے ہیں جہاں متبادل اردو، فارسی یا عام فہم عربی الفاظ اس معنوی وسعت کے ساتھ میسر نہ ہوں جو ان کا صحیح مفہوم واضح کرسکیں یا ایسے الفاظ جواب عام مستعمل ہیں، مثلاً: سوسائٹی، میٹنگ، انسپکشن، الیکشن، انسپکٹر، سکالر، سٹوڈنٹ وغیرہ وغیرہ۔

لیکن آج کل بعض کسرِ نفسی یا احساسِ کمتری کے شکار لوگ انگریزی نہ جاننے کے باوجود انگریزی کے الفاظ بے جا استعمال کر کے اپنی علمی برتری کا مظاہرہ کرنے میں فخر محسوس کرتے ہیں، مثلاً: ایک صاحب اپنے ساتھیوں کو کسی جلسے کی روداد سنا رہے تھے، ان کی باتیں کچھ اس طرح تھیں: جب ہم ہال میں انٹر (Enter) ہوئے تو اندر گیدرِنگ (Gathering) (مجمع) کچھ خاص نہیں تھی، بہت سی کرسیاں ایمپٹی (Empty) پڑی تھیں، سپیکر بہت لاؤڈلی (Loudly) بول رہا تھا، میں واپس آ گیا، اس لیے کہ وہاں خواہ مخواہ ٹائم

ویسٹ ہونا تھا۔

ان جملوں میں ''انٹر'' کی جگہ ''داخل''، ''گیدرنگ'' کی جگہ ''مجمع یا اجتماع''، ایمپٹی کی جگہ ''خالی''، سپیکر کی جگہ ''مقرر'' اور ''لاؤڈلی'' کی جگہ ''زور زور سے'' یا ''بلند آواز سے'' ہماری زبان میں موجود ہیں، اس قسم کی بے تکی گفتگو وحشت آمیز ہوتی ہے۔

اب اس ''جنٹلمین'' کو یہ بھی معلوم نہیں کہ ''خالی'' کے لیے ''ایمپٹی'' (Empty) کا لفظ ان ظروف کے لیے استعمال ہوتا ہے جو ڈھکے جاتے ہیں یا کسی چیز سے ان کا منہ بند کیا جاتا ہے، وہ خالی ہوں تو ان کے لیے ایمپٹی کا لفظ استعمال ہوتا ہے، جیسے: بوتل، دیگچی، ڈرم، ٹنکی وغیرہ۔ کرسی کے خالی ہونے کو ''ویکنٹ'' (Vacant) کہیں گے، کیوں کہ وہ سیٹ ہے۔ ''ٹائم ویسٹ ہونا'' کے بجائے ''وقت ضائع ہونا'' جیسے الفاظ موجود ہیں۔ انگریزی الفاظ کا بے جا استعمال ہمارے لیے کسی طرح کی برتری کا ذریعہ نہیں۔

غلط مقام پر الفاظ کا استعمال:

بعض جملوں میں غلط مقام پر الفاظ کا استعمال بھی جملے کی معنویت کو مشکوک بنا دیتا ہے، مثلاً: ''میری عدالتِ عالیہ سے یہ گزارش ہے کہ...''، یہاں ''میری عدالتِ عالیہ'' کہنے سے مفہوم بدل گیا۔ حالانکہ میری کا تعلق گزارش سے ہے، اس لیے یہ جملہ یوں ہونا چاہیے تھا: ''عدالتِ عالیہ سے میری گزارش ہے۔''، ''میرے پروفیسر صاحب نے الفاظ ہی نہیں سنے تھے۔'' یہ بھی یوں ہونا چاہیے: ''پروفیسر صاحب نے میرے الفاظ ہی نہیں سنے تھے۔''

ایک جگہ حضرت امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے نام میں ''حنبل'' کو حمبل لکھا ہوا دیکھا، اسی طرح ایک صاحب نے ''منبر و محراب'' کو ممبر و مہراب لکھا۔ بعض لوگ ''مُثبت'' کو ''مثبَت'' بولنے لگے ہیں، ''جواں سال'' کو جواں سالہ (سالہ کا لفظ صرف گنتی کے ساتھ آئے گا، جیسے پچیس سالہ) اس قسم کی اَغلاط سے پرہیز لازم ہے۔

اشعار میں غلطی:

ہمارے دوست اپنی تحریروں میں شعروں کا استعمال کرتے ہوئے بڑی بے احتیاطی کا ثبوت دیتے ہیں۔ بعض تو ان کے الفاظ کو آگے پیچھے کر کے وزن کا ستیاناس کر دیتے ہیں اور بعض اس کی معنویت کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے الفاظ ہی میں رد و بدل کر دیتے ہیں اور شعر کی ہیئت مضحکہ خیز ہو جاتی ہے۔

✿ مثلاً ایک شعر ہے ؎

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا
آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا

اس پر یہ مشقِ ستم کی گئی ؎

ابھی تو ابتدا ہے عشق کی روتا ہے کیوں
ذرا آگے دیکھنا کیا کیا ہوتا ہے

✿ ایک فارسی مصرع ہے ؎

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

اس کو یوں لکھا:

ہمہ آرزو کہ خاک شدہ

❀ اسی طرح مشہور شعر ہے ؎

اٹھو وگرنہ حشر نہیں ہو گا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا

اس کی کتر بیونت یوں کی گئی ؎

اٹھو وگرنہ حشر نہ ہو گا
زمانہ چال قیامت کی چل گیا

❀ علامہ اقبال کا ایک مشہور شعر ہے ؎

عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں
نظر آتی ہے اس کو اپنی منزل آسمانوں میں

(بال جبریل، ص:120، نظم ''ایک نوجوان کے نام'')

اس کے دوسرے مصرع میں ''اس'' عقابی روح کی ضمیر ہے، اس لیے صیغہ واحد میں ہے، لیکن ہمارے اکثر احباب وہاں ''ان'' لکھتے ہیں اور اسے جوانوں کی ضمیر سمجھتے ہیں۔ بادی النظر میں تو یہی معلوم ہوتا ہے، مگر علامہ نے یہاں عقابی روح کے لیے ''اس'' کا استعمال کیا ہے، لہٰذا احباب کو اس میں احتیاط رکھنی چاہیے۔

انشا پردازی (مضمون نگاری) بھی ایک فن ہے، جس کے ذریعے سے صاحبِ مضمون کسی خاص موضوع پر خامہ فرسائی کے ذریعے اپنے جذبات یا اپنی خصوصی معلومات قاری تک پہنچاتا ہے، اس کے لیے ضروری ہے کہ صاحبِ تحریر اس زبان سے کماحقہ واقف ہو اور جملہ سازی اور عبارت آرائی کے تقاضے اس زبان کے قواعد اور روزمرہ و محاورے کے مطابق پورا کرے۔ اپنے موقف کی تائید میں اگر اسے کسی دوسری زبان کی اصطلاحات یا محاورے یا محض الفاظ استعمال کرنے کی ضرورت لاحق ہو تو اس کو اپنی زبان کے ساتھ اس طرح ہم آہنگ کرے کہ قاری کو اس سے لذت اور افادیت حاصل ہو نہ کہ وحشت و حیرت۔

انگریزی اور عربی الفاظ کا استعمال:

ہمارے اردو زبان کے مضمون نگار آج کل انگریزی اور عربی کے الفاظ کو بے دریغ استعمال کرنے کا شوق رکھتے ہیں، تاکہ پڑھنے والا ان کی وسعتِ علم کا بھی قائل ہو جائے، لیکن وہ ان کو اس ''بے دردی'' سے لڑھکا دیتے ہیں کہ مزا کرکرا ہو جاتا ہے۔ ایک دو مثالیں دیکھیے:

① ''آج (فلاں پارٹی) کا جلوس ونڈرفل مظاہرہ تھا۔''

جو شخص انگریزی نہیں جانتا، وہ دوسروں سے پوچھ سکتا ہے کہ یہ لفظ

"ونڈ رفل"، میری سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ کس قسم کی رفل (بندوق) ہوتی ہے؟ کیا کسی ونڈ نامی انگریز نے یہ رفل کلاشنکوف کے مقابلے میں ایجاد کر دی ہے؟ جب وہ اسے بتاتا ہے کہ اس لفظ کا معنی ہے: "حیرت ناک"، رفل سے اس کا کوئی تعلق نہیں تو وہ بچارا خود حیرت ناک مظاہرہ کرتا ہے اور بول اٹھتا ہے کہ کیا اس کے مقابلے میں ہماری زبان کا لفظ "حیرت ناک" اتنا پرانا ہو گیا ہے کہ اب اس کا چلن نہیں رہا۔

ہمارے انگریزی دانوں کو اردو زبان میں وہی لفظ لانے چاہئیں جن کا بدل اردو میں نہ ہو اور قوسین میں ان کا مطلب یا مفہوم بھی درج کریں۔ اردو زبان اتنی گئی گزری نہیں کہ انگریزی کے گھسے پٹے الفاظ سے عبارت کو بوجھل، بلکہ بعض اوقات مہمل بنا دیا جائے۔ یہ ضروری نہیں کہ لوگوں پر اپنی انگریزی دانی کا رعب گانٹھنے کی کوشش کی جائے۔

④ عربی دان حضرات بھی بعض اوقات بوالعجبی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اردو عبارت کو "چیستان" بنا دیتے ہیں۔ ایک جگہ یہ جملہ نظر سے گزرا: "ان آیات سے صاف کنیمروز واضح ہوا کہ... الخ"

نیمروز فارسی لفظ بہ معنی "دوپہر کا وقت" ہے اور مغربی افغانستان کی ولایتِ سیستان کو بھی نیم روز کہتے ہیں۔ اس پر عربی کا حرفِ تشبیہ "ک" لگا کر "دوپہر کی طرح" کے لیے "کنیمروز" کا مرکب وضع کیا گیا ہے جو اصولِ قواعد کے بھی خلاف ہے اور ایک طرح کی غرابت کا بھی حامل ہے۔ اس کے بجائے اردو میں "روزِ روشن کی طرح" کا روزمرہ موجود ہے۔ اگر عربی کی برتری

دکھانا مقصود ہو تو "اظہر من الشمس" اردو میں عام مستعمل ہے اور اگر "روزِ روشن" ہی دکھانا منظور تھا تو اس کے لیے "كَالشَّمْسِ فِيْ نِصْفِ النَّهَارِ" بھی کہا جا سکتا تھا۔

امید ہے کہ ہمارے اہلِ قلم اس کا خیال رکھیں گے۔

مرکبات:

دو الفاظ ایک ہی مفہوم میں جمع کرنے کے لیے جو قواعد وضع کیے گئے ہیں ان کو مرکبات کہتے ہیں، جیسے: جوشِ بیان، زورِ قلم، نقد و نظر، کتاب و سنت، کتاب العلم اور وسیع النظر وغیرہ۔ یہ طریقِ ترکیب صرف فارسی اور عربی میں ہوتا ہے، جیسے اوپر کے پہلے چار مرکبات فارسی اور دوسرے دو عربی ہیں۔

اربابِ قواعد و نحو نے اس کے اصولوں میں یہ اصول خاص طور پر قائم کر رکھا ہے کہ عربی یا فارسی کے مرکبات کے لیے مرکب کے دونوں لفظ یا عربی ہوں یا فارسی، ایک زبان کا لفظ دوسرے زبان کے لفظ سے ملا کر مرکب بنانا معیوب ہے، لیکن مسلمانوں کی اخوت نے عربی، اردو، فارسی کو چونکہ مادری زبانوں کی طرح عزیز بنا دیا، اس لیے ان دونوں زبانوں کے الفاظ (کم از کم ہمارے ملک میں اور شاید ایران میں بھی) کے مرکب کا استعمال جائز بنا لیا ہے، جیسے پیکرِ حرمت، جوشِ جہاد، رگِ حمیت، گرد و غبار وغیرہ، مگر اردو (ہندی) کے الفاظ میں اس کی ممانعت بدستور ہے، مثلاً:

مرکبِ اضافی: تمازتِ سورج، چمکِ مہتاب، گونجِ طوفان، ٹکڑائے نان اور صاحبِ گھر وغیرہ۔

مرکبِ عطف: چاند و آفتاب، دھرتی و آسمان، سوچ و فکر، دل و آنکھ اور بے باک و نڈر وغیرہ۔

بعض احباب زورِ قلم میں ایسی بہت سی بوالعجبیاں پیدا کر دیتے ہیں، مثلاً: ایک صاحب نے لکھا: ''پورے سامان کی خریداری و دیکھ بھال اس کے ذمے تھی'' اس میں واؤ عطف کا استعمال خواہ مخواہ ہے۔ یوں بھی یہ دونوں کام الگ الگ نوعیت کے ہیں، اس لیے ان کے درمیان اردو کا لفظ ''اور'' لکھنا چاہیے تھا۔

ایسے ہی ایک جملہ یوں تھا: ''وہ کام اس کی سوچ و توقعات کے برعکس ثابت ہوا'' یہاں بھی ''واؤ'' کے بجائے ''اور'' کا تقاضا ہے۔ یہ مرکبات کے مسلمہ اصول کی بھی خلاف ورزی ہے اور اضافتوں کا بھونڈا استعمال ہے۔

یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ اردو اور ہندی میں عطف کا کام ''اور'' سے لیا جاتا ہے اور اضافت کے لیے ''کا، کی، کے'' استعمال ہوتے ہیں۔ فارسی عربی کی طرح مرکبات کا تکلف نہیں کرنا چاہیے، ہاں عربی فارسی کے مرکبات سے عبارت آرائی کا کام لیا جا سکتا ہے۔

ایک ترقی پسند عزیز کہنے لگے کہ اگر اردو فارسی مرکبات بنا لیے جائیں تو کیا حرج ہے؟ میں نے کہا: کیسے؟ کہا: مثلاً: تہِ تلوار (بجائے تہِ تیغ) میں نے کہا: یہ ہے تو بے ضرر سا ہی، مگر ایک دفعہ چل نکلے تو یار لوگ بھانڈائے زر، تھالیِ حلوہ، ڈنڈائے شجر، ٹہنیِ برگد، پیڑِ ثمر دار اور روغنِ چیڑ وغیرہ سے ادھر نہیں ٹھہریں گے اور اردو زبان قلعۂ معلّٰی میں جا کر پناہ گزین ہو جائے گی۔

مسلمہ محاوروں میں بگاڑ:

ہر زبان اپنے مسلمہ محاورے رکھتی ہے، جن کا مفہوم اس کے اپنے معاشرے میں جانا پہچانا ہوتا ہے، مثلاً انگریزی کا محاورہ ہے: ''اِٹ اِز ریننگ کیٹس اینڈ ڈاگز'' (It is raining cats and dogs) جس کا متبادل ہمارے ہاں یہ ہے: ''موسلا دھار بارش ہو رہی ہے۔'' اگر اس کا لفظی ترجمہ یوں کریں: ''بارش کتے بلیاں برس رہی ہیں'' تو کتنا مضحکہ خیز ہوگا؟

یہ مثال ازراہِ تفنن بھی بیان کی گئی ہے اور یہ بھی بتانا مقصود ہے کہ محاورے کے الفاظ جو طے ہو گئے ہیں، وہی استعمال ہوں گے تو زبان کا حق ادا ہو گا۔ انگریز کیٹس اینڈ ڈاگز کو نہیں بدل سکتے اور ہم موسلا دھار کا نعم البدل نہیں لا سکتے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس مفہوم کے لیے دوسرے جملے استعمال کر لیں، لیکن وہ بھی کسی روز مرہ اور محاورے ہی میں ہوں گے، مثلاً: ''آج چھاجوں بارش برس گئی۔'' وغیرہ، مگر ہم اپنی طرف سے دھاروں بارش یا چھلنیوں بارش نہیں کہہ سکتے۔ (''موسلا دھار'' میں ''مُوسلا'' اناج کوٹنے والے چوبی آلے ''موسل'' کی تصغیر ہے۔)

محاورے سے انحرافِ الفاظ کی ایک مثال سامنے آئی تھی جس کے باعث یہ طویل تمہید لکھنی ضروری سمجھی، وہ یوں تھا: ''مسجد اپنی وسعت کے باوجود اپنی تنگ دامنی کا نقشہ پیش کر رہی تھی!'' اس سے صاحبِ تحریر کا مقصد خطیب کے سامعین کی کثرتِ تعداد بیان کرنا تھا۔ ہمارے ہاں ایسے منظر کے لیے ''تنگ دامنی کا گلہ کرنا'' مستعمل ہے، نقشہ پیش کرنا نہیں۔ فارسی میں بھی اس کی ایک

مثال اس معنی میں ہے ؎

داماںِ نگہ تنگ و گلِ حسنِ تو بسیار
گلچینِ تو از تنگیِ داماں گلہ دارد

''میرا دامنِ نگاہ تنگ ہے اور تیرے حسن کے پھول بہت زیادہ ہیں۔
تیرے پھول چُننے والے کو دامن کے تنگ ہونے کا گلہ ہے۔''

متعلقات میں بُعد:

عبارت میں سلاست اور معنوی درستی کو قائم رکھنا بہت ضروری ہے۔ بعض اہلِ قلم اس کا خیال بہت کم رکھتے ہیں، چند مثالیں درج ذیل ہیں:

① ''گھوڑوں کے سُموں سے لہلہاتی فصلیں پامال کر دی گئیں۔''

اس سے پہلی نظر میں یوں لگتا ہے کہ فصلیں گھوڑوں کے سموں سے لہراتی تھیں۔ گو جملہ پڑھنے سے اصل معنی سمجھ میں آ جاتے ہیں، مگر جملے کی سلاست یوں بنتی ہے: ''لہلہاتی فصلیں گھوڑوں کے سموں سے پامال کر دی گئیں۔'' پامالی کا تعلق سُموں سے ہے، اس لیے ان کے درمیان بُعد (فاصلہ) درست نہیں ہوگا۔

② ''ایک بھارت کا سمگلر بارڈر پر گرفتار کر لیا گیا۔''

اس جملے میں ''ایک'' کا تعلق سمگلر سے ہے، بھارت سے نہیں، لہٰذا جملہ یوں ہونا چاہیے: ''بھارت کا ایک سمگلر بارڈر پر گرفتار کر لیا گیا۔''[1]

③ ''چور کی کچہری میں پیشی ہوئی تو اسے سزا دی گئی۔''

اس میں کچہری کا تعلق چور سے نہیں، اس لیے جملہ یوں ہونا چاہیے:
''کچہری میں چور کی پیشی ہوئی تو... الخ۔

---

[1] اکثر حضرات ''بھارت'' کے بجائے ''انڈیا'' بولتے لکھتے ہیں جو مناسب نہیں، کیوں کہ متحدہ ہندوستان بھی انگریزی میں انڈیا کہلاتا تھا اور اب بھارت کا انگریزی نام بھی انڈیا ہے۔

④ ''بعض لوگ کسی زندگی کے اصول کے پابند نہیں ہوتے۔''

لفظ ''کسی'' کا تعلق زندگی سے نہیں، اصول سے ہے، اس لیے اس کو یوں لکھنا چاہیے: ''بعض لوگ زندگی کے کسی اصول کے پابند نہیں ہوتے۔''

عبارت میں اسما و افعال اور صفت و موصوف وغیرہ میں بُعد نہیں رکھنا چاہیے۔

پروا:

''پروا'' فارسی لفظ ہے، جس کے معنی توجہ، حاجت، خواہش اور فکر وغیرہ ہیں۔ اردو میں اس کا استعمال عموماً توجہ (التفات) اور فکر کے معنوں میں ہوتا ہے، جیسے: ''تم نے اپنے افسر کے حکم کی پروا نہیں کی۔'' یا ''تمھیں بار بار تاکید کی گئی تھی کہ وقت پر دفتر آیا کرو، مگر تم نے کوئی پروا نہیں کی۔''

اس کی املا میں عموماً یہ غلطی کی جاتی ہے کہ اس کے آخر میں ''ہ'' لگا دی جاتی ہے، یعنی ''پرواہ'' لکھ دیا جاتا ہے اور غلطی سے یہ رائج ہو گیا ہے، اسی سے ''لاپرواہی'' کا لفظ بنایا گیا ہے، اس کی املا بھی ''لاپروائی''[1] ہونی چاہیے۔

''لاپرواہی'' اپنی ساخت میں بھی غلط ہے، کیوں کہ عربی کا حرف ''لا'' اس فارسی لفظ کے ساتھ نہیں لگانا چاہیے۔ فارسی میں اس کے لیے ''بے'' کا حرف موجود ہے، لہٰذا ''بے پروائی'' لکھنا چاہیے۔

بہترین۔ زیادہ بہترین:

ایک جگہ یہ جملہ لکھا دیکھا: ''ہوٹل میں مہمانوں کے لیے زیادہ بہترین انتظام تھا۔''

[1] بلکہ اس کی املا ''بے پروائی'' ہونی چاہیے، جیسا کہ آگے وضاحت موجود ہے۔

''بہترین'' فارسی لفظ ہے (اسمِ صفت کا تیسرا درجہ)۔ قواعد میں صفت کے تین درجے ہیں: بہ، بہتر، بہترین۔ دوسرا درجہ اور تیسرا درجہ تفضیلِ بعض اور تفضیلِ کل کہلاتے ہیں۔ اردو میں بھی ہم اچھا، بہت اچھا، بہت ہی اچھا (یا سب سے اچھا) کہتے ہیں۔ فارسی میں پہلے درجے کے بعد ''تر'' اور ''ترین'' لگا کر دوسرا اور تیسرا درجہ بناتے ہیں۔ دوسرے درجے کے لیے جملہ یوں ہوتا ہے:

''حامد رشید سے بہتر تیراک ہے۔''

یعنی دو اسماء کا مقابلہ ہوتا ہے۔ لیکن تیسرا درجہ سب سے اچھا (یا برا) یعنی بہترین یا بدترین کہیں گے تو اس سے پہلے ''بہت'' یا ''زیادہ'' یا ''سب سے'' کے الفاظ استعمال نہیں ہوں گے، کیوں کہ ''ترین'' لگنے سے وہ چیز یا انسان پہلے ہی مقابلتاً سب سے اچھا یا برا ہو گا۔

ابھی بھی۔ کبھی بھی:

عام طور پر اہلِ قلم یا پیشہ ور منشی ''ابھی'' اور ''کبھی'' کے ساتھ ایک اور ''بھی'' لگا کر جملہ ثقیل کر دیتے ہیں۔ یہ تو سامنے کی چیز ہے کہ ''بھی'' ان دونوں میں پہلے سے موجود ہے۔ یعنی ''ابھی'' (اب بھی) اور ''کبھی'' (کب بھی یہ معنی کسی وقت بھی)

اس کے غلط استعمال کی مثالیں ملاحظہ فرمائیے:

① ''فلاں شخص نے مجھ سے تین ہزار روپے قرض لیے۔ دو ہزار تو واپس کر دیے، مگر چھے ماہ ہو گئے، ایک ہزار روپیہ ابھی بھی باقی ہے۔'' (یہاں ''بھی'' زائد ہے)

ہا (ہ):

ہا (ہ) اردو حروفِ تہجی کا چونتیسواں حرف ہے، اس کی تین ہیئتیں ہیں:
① ہائے ملفوظ ② ہائے مخلوط ③ مختفی۔ اس کی آخری ہیئت عموماً الفاظ کے آخر میں ہوتی ہے، جیسے بہ، کہ، آہ، چاہ، راہ، سایہ اور مایہ وغیرہ۔

پہلی دونوں ہیئات میں عموماً باہم مشتبہ صورت پیش آتی رہتی ہے اور وہ بھی املا کی غلطی سے واقع ہوتی ہے، اس لیے ان سطور میں ایسے اشتباہ سے بچنے کی کوشش کرنی چاہیے، اس کو ذرا تفصیل سے لکھنا ضروری ہے۔

ہائے ملفوظ:

یہ حرفِ سالم ہے اور تلفظ میں اپنی الگ آواز رکھتا ہے، مثلاً: ہار، بہت، بہار، پہلے، دہلی، ٹہنی، کہاں، جہاں، وغیرہ۔

ہائے مخلوط:

یہ خالص ہندی حرف ہے، جس کی املا ''ھ'' (دوچشمی) ہوتی ہے۔ یہ حروفِ تہجی کے بعض حروف سے مخلوط ہوتی ہے اور اس حرف کی اپنی آواز سے مختلف آواز پیدا کرنے کا ذریعہ ہوتی ہے۔ مثلاً: بھائی، پھول، ٹھوکر، جھولی، چھلنی، دھوبی، ڈھول، بڑھئی، کھانا اور گھاٹی وغیرہ۔

گویا اس کا رشتہ ب، پ، ت، ٹ، ج، چ، د، ڈ، ڑ، ک، گ، ل اور چند الفاظ میں ''م'' کے ساتھ ہوتا ہے۔

اگر ہائے ملفوظ کے الفاظ میں ہائے مخلوط کی املا کر دی جائے تو معنویت تبدیل ہوسکتی ہے۔ مثلاً: ''بہائی'' کو ''بھائی'' لکھنے سے بہائی مذہب ذہن میں

نہیں آئے گا، بلکہ بھائی (برادر) آئے گا۔ اسی طرح ''پہلے'' کو ''پھلے'' لکھنا غلط ہوگا۔ اسی پر دوسرے الفاظ کا قیاس کیا جا سکتا ہے۔

ہمارے عربی دان احباب کی تحریر میں عموماً ہائے مخلوط کا استعمال بہت زیادہ ہوتا ہے، اس سلسلے میں انھیں ایسے الفاظ کی املا میں یہ احتیاط رکھنی چاہیے کہ وہ لفظ کسی اردو ہندی لفظ سے مشتبہ تو نہیں ہوتا۔ اس دوچشمی ''ھ'' کے رشتے داروں کا ذکر اوپر آچکا ہے، ان سے لکھے جانے والے فارسی یا عربی الفاظ، بلکہ اردو الفاظ بھی اگر ہائے ملفوظ کی آواز رکھتے ہیں تو ان کو اردو میں ہائے مخلوط سے نہ لکھنا چاہیے، مثلاً: ''جہل'' کو ''جھل'' اور ''چہلم'' کو ''چھلم'' نہ لکھا جائے۔ ''چہرے'' کو ''چھرے'' لکھنے اور ''پہلو'' کو ''پھلو'' لکھنے سے کتنی مضحکہ خیز صورت بنے گی؟!

کارروائی۔ بدُعا:

اوپر لکھے گئے مرکبات میں:

① ''کار'' کے آخر میں اور ''روائی'' کے شروع میں حرفِ را آتا ہے۔

② بد کے آخر اور دعا کے شروع میں صرف دال آتا ہے۔ ہمارے بعض ''کاہلے'' قلم کاران مشترکہ حروف کو صرف ایک دفعہ لکھ دیتے ہیں، یعنی: کاروائی اور بدعا۔ یہ ''کاہلی'' دونوں مرکب الفاظ کو بے معنی بنا دیتی ہے، اس سے پرہیز کرنا چاہیے۔

اے مومنوں۔ اے مسلمانوں:

اوپر دیے گئے ندائیہ الفاظ ہیں، جو کسی مجمع کو مخاطب کر کے بولے جاتے ہیں۔ بے شک اردو میں واؤ اور نون غنہ سے اردو میں جمع کا صیغہ بنتا ہے، مگر صدا دینے یا مخاطب کرنے کے لیے نون غنہ بولنا اور لکھنا (دونوں طرح) غلط ہے، وہاں صرف ''اے مومنو'' اور ''اے مسلمانو'' لکھا یا بولا جائے گا، اسی پر قیاس کر کے دوسرے الفاظ دوستو، بھائیو اور لوگو وغیرہ استعمال ہوگا۔

شُد بُد:

کسی کام میں تھوڑی سی مہارت یا کسی علم میں ابتدائی آگاہی کو ''شُد بُد''

کہا جاتا ہے۔ بعض دوست اس کو شدھ بدھ لکھتے اور بولتے ہیں جو غلط ہے، وہ غالباً ہندی (اردو) کے لفظ بدھ بہ معنی عقل پر قیاس کر کے کچھ جاننے کو ''شدھ بدھ'' کہنے لگے ہیں، حالانکہ ہندی اور اردو میں اس کے لیے لفظ سوجھ بوجھ موجود ہے اور شُدّھ کے معنی درست کرنا ہے۔ بدھ کے ساتھ مل کر یہ ہندی میں ایک مرکب کے طور پر مستعمل ہیں۔ ''شُد'' (فارسی) ہوا، ہو گیا اور ''بُد'' (بُود کا مخفف) ''تھا'' کے معنوں میں مستعمل ہے، لہٰذا تھوڑی سی معلومات کے معنوں میں شُد بُد درست ہے، شدھ بدھ نہیں۔

درستگی۔ حیرانگی وغیرہ:

یہ لفظ کچھ زیادہ ہی مستعمل ہونے لگے ہیں، حالانکہ صریحاً غلط ہیں۔ اسماء پر ''گی'' کا اضافہ یوں ہوتا ہے کہ فارسی اسم مفعول جس کے آخر میں ''ہ'' (ہائے ہوز) آتی ہے، اس کی ''ہا'' حذف کر کے ''گی'' لگایا جاتا ہے، مثلاً: آراستہ سے ''آراستگی'' شائستہ سے ''شائستگی''، وارفتہ سے ''وارفتگی''، پژمردہ سے ''پژمردگی''، آمادہ سے ''آمادگی'' وغیرہ۔

مگر لفظ درست اور حیران اسمائے صفت ہیں، ان کے آخر میں صرف یائے معروف آئے گی اور وہ درستی اور حیرانی بولے جائیں گے۔

مرکب الفاظ کی املا:

بعض مرکب الفاظ کی املا ہمارے ہاں عموماً غلط رواج پا گئی ہے، یعنی مرکب اسماء کے دونوں لفظ ایک ساتھ (ملا کر) لکھ دیے جاتے ہیں، مثلاً: گوجراں والا کو گوجرانوالا یا کوٹ رادھاکشن کو کوٹرادھاکشن، ماموں کانجن کو ماموںکانجن وغیرہ۔ ان میں سے دوسرا نام ''کوٹرادھاکشن'' خاص طور پر ''بدنما'' ہیئت رکھتا ہے، ایسے ہی دوسرے الفاظ کے ساتھ سلوک کیا جاتا ہے، مثلاً: دل برداشتہ کو دلبرداشتہ، بے خوابی کو بیخوابی، اہلِ حدیث کو اہلحدیث۔ اسی طرح کے بہت سے الفاظ ہیں جن کو ملا کر لکھنے کی عادت سی بن گئی ہے۔

یہ یاد رکھنا چاہیے کہ مرکبات کا تلفظ آواز سے سمجھ میں آجاتا ہے، مثلاً: اہلِ حدیث مرکبِ اضافی ہے۔ ''اہل'' کی لام کے ساتھ اضافتِ کسرہ ہے جو دونوں لفظوں کو الگ کرتی ہے۔ کوٹ رادھاکشن میں کوٹ (قلعہ) اپنے بانی رادھاکشن سے نسبت کا اعلان کر رہا ہے، اس لیے دونوں کی انفرادی حیثیت الگ الگ ہے، ان کو اکٹھا یوں پہلے لفظ کا آخری یا دوسرے لفظ کا پہلا حرف ملا کر لکھیں تو دونوں کی معنوی یا صوتی حیثیت نہایت مضحکہ خیز ہو جائے گی، مثلاً: دل برداشتہ (کسی شخص یا چیز سے دل ہٹا لینا، یعنی اس سے علاحدہ ہو جانا وغیرہ) کو دلبرداشتہ لکھنے سے دونوں کی ہیئت دلبر اور داشتہ میں تبدیل ہوگئی۔ اب یہ دلبر

(محبوب یا اسمِ علم) اور داشتہ (رکھی ہوئی یا رکھا ہوا) کی کیا تعبیریں کریں گے؟

''بے'' کے مرکبات میں یہ خیال رہنا چاہیے کہ ''بے'' الگ رہے، مثلاً: بے خبر، بے خود، بے لحاظ اور بے حجاب وغیرہ۔

میرے خیال میں ایسے الفاظ کی ایک ساتھ املا کر دینا ٹھیک نہیں جن کی معنویت یا تو بالکل مسخ ہو جائے یا اس میں تبدیلی آ جائے۔ ایسی املا سے پرہیز کرنا چاہیے۔

پروا:

یہ فارسی کا لفظ ہے، جس کے معنی توجہ، خواہش، فکر اور خوف وغیرہ کے ہیں اور اردو میں بھی اپنی کیفیات کے لیے مستعمل ہے، اس کے آخر میں ''ہ'' لگانے کا رواج معلوم نہیں کب ہوا اور اس کو ''پرواہ'' بنا دیا گیا جو صریحاً غلط ہے۔ اس کی املا میں ''ہ'' کا استعمال نہیں کرنا چاہیے۔

عموماً یہ لفظ تنہا استعمال ہوتا ہے، مگر اسے مرکب بھی استعمال کیا جاتا ہے، مثلاً:

نہیں جس قوم کو پروائے نشیمن تم ہو

یہ ''پروائے نشیمن'' ہے، ''پرواہِ نشیمن'' نہیں!!

اساتذہ کے ہاں ''پرواہ'' (ہ کے ساتھ) کہیں نہیں ملے گی۔ اگر کسی دوسرے درجے کے شاعر کے کلام میں ایک آدھ شعر میں اس کی مثال مل جائے تو اسے سند نہیں مانا جائے گا۔

کرم نوازی:

یہ الفاظ اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگوں کی زبان سے سنے جاتے ہیں جو

اللہ تعالیٰ کے کسی انعام پر شکر گزاری کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں: ''یہ اللہ تعالیٰ کی کرم نوازی ہے کہ میرے بیٹے میرے بڑھاپے میں میری خدمت کا پورا پورا حق ادا کرتے ہیں۔'' وغیرہ!

کرم نوازی غلط ترکیب ہے، اس کی جگہ ''کرم فرمائی'' کہنا چاہیے۔ نوازنا کسی کو عزت عطا کرنے یا کوئی عہدہ دے کر بلند مقام دینے کو کہتے ہیں، جیسے: اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندہ نواز اور بندہ نوازی عام فہم الفاظ ہیں، جب کہ کرم کوئی جاندار شے نہیں، بلکہ ایک صفت ہے جو اللہ تعالیٰ میں اور بندوں میں پائی جاتی ہے اور اس کے ساتھ ''کرنا'' اور ''فرمانا'' استعمال ہوگا، یعنی کرم کرنا یا کرم فرمانا۔ انسانوں کی طرف سے بھی انسانوں پر کرم فرمائی کہنا چاہیے، کرم نوازی کہنا غلط ہوگا۔

دیوالا۔ دیوالیا:

کسی مقروض شخص کا قرض ادا نہ کر سکنے کا ثبوت عدالت میں پیش کرنے کو دیوالا کہا جاتا ہے اور لکھا جاتا ہے کہ فلاں شخص کا دیوالا نکل گیا یا فلاں شخص دیوالیا ہوگیا۔ جس کا دیوالا نکلتا ہے، اس کو دیوالیا کہا جاتا ہے۔ بعض لوگ یوں لکھ دیتے ہیں: ''فلاں شخص کا دیوالیا نکل گیا۔'' یہ غلط ہے، اس عبارت میں دیوالیا کے بجائے دیوالا لکھنا چاہیے۔

چاہ کَن۔ کارکُن:

یہ اصل لفظ چاہ کَن (کاف پر زبر) ہے، یعنی کنواں کھودنے والا۔ فارسی میں کَن (زبر کے ساتھ) مصدر کندن (کھودنا) کا فعل امر ہوگا اور وہ کسی اسم کے ساتھ لگ کر اسے اسم فاعل بنا دیتا ہے۔ چاہ کَن، کوہ کَن اور کان کَن اسی قبیل سے ہیں۔ اگر کاف پر پیش ڈال دی جائے تو وہ کُن (کر) کردن کا فعل امر ہوگا اور وہ کسی اسم کے ساتھ لگ کر اسے فاعل بنا دے گا، جیسے کارکُن (کام کرنے والا) ہے۔ اس کے تلفظ اور اِملا میں اس فرق کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔

شِکَست:

بعض احباب اس لفظ کے تلفظ میں کاف کے نیچے زیر بولتے ہیں، یعنی شکِست، یہ نہایت بھونڈا اور غلط تلفظ ہے، اس میں کاف پر زبر بولنی چاہیے۔ شِکَست، یعنی شین کے نیچے زیر اور کاف پر زبر بولا اور لکھا جائے۔

[illegible]

[illegible] عبارت [illegible] ضرور لکھا جاتا ہے، یہ [illegible] غلط ہے [illegible] تاریخ دیا گیا۔ یہ عموماً دستاویزات (تحریرات) کے ساتھ تعلق رکھتا ہے اور جب کسی تحریر کا ذکر کریں

گے تو لکھا جائے گا: ''فلاں معاہدہ مورخہ 14 جون 1947ء ہمارے حق میں جاتا ہے۔'' یعنی وہ معاہدہ 14 جون 1947ء کو لکھا گیا تھا۔

اب ہمارے دوست ہر جگہ تاریخ کے ذکر میں ''مورخہ'' کا لفظ خواہ مخواہ لکھیں گے، مثلاً: مورخہ 13 مئی کو جلسہ منعقد ہوا۔ اب یہاں مورخہ کا کیا مفہوم ہے؟ اگر تاریخ کا ذکر ضروری ہو تو لکھنا چاہیے: ''بتاریخ 13 مئی جلسہ منعقد ہوا۔'' اس صورت میں لفظ ''کو'' حذف ہو جائے گا، کیوں کہ بتاریخ میں ''ب''، ''کو'' کا معنی دے رہا ہے۔ اس کوفت سے بچنے کے لیے صرف تاریخ لکھ دینا کافی ہوگا، جیسے: 13 مئی کو جلسہ منعقد ہوا۔

بعض بڑے طمطراق سے لکھتے ہیں: ''آج مورخہ (... تاریخ ...) کو ایک میٹنگ ہوئی، جس میں فلاں فلاں امور طے پائے۔'' وغیرہ ''آج مورخہ'' نہایت غیر مناسب ہے، ایسی تحریر میں ''آج'' کے بعد تاریخ کی بھی ضرورت نہیں، البتہ عبارت ختم ہونے پر تاریخ ڈالنی چاہیے۔

ابھی تک۔ ابھی بھی:

یہ جو عام طور پر کہا جاتا ہے: ''جلسے کے آغاز کا وقت ہو چکا ہے، مگر جناب صدر ابھی تک نہیں آئے۔'' اس میں ''تک'' اضافی ہے۔ ''ابھی'' میں ''تک'' کا مفہوم موجود ہے، البتہ ''اب تک'' کہا جا سکتا ہے۔ اس مفہوم میں فارسی کا لفظ ''ہنوز'' بھی لکھا اور بولا جاتا ہے۔ مگر اس کے ساتھ غلط طور پر ''تا'' لگا دیا جاتا ہے، یعنی: ''تاہنوز'' انھوں نے فلاں کام نہیں کیا۔'' اس میں ''تا'' اضافی ہے، ہنوز کے اندر ''تا'' کا مفہوم موجود ہے۔

بعض دوست لکھتے ہیں ''ہم تو لاہور میں آ گئے، مگر ہمارا بھائی ابھی بھی بورے والا میں رہائش پذیر ہے۔'' یاد رہے کہ لفظ ابھی ''اب بھی'' کا مرکب ہے، اسی لیے اس کے ساتھ مزید ''بھی'' لگانا درست نہیں۔ اسے یوں لکھا جائے کہ ''ہمارا بھائی ابھی بورے والا میں ہے۔'' ابھی کے ساتھ بھی کا استعمال بہت بھدا معلوم ہوتا ہے اور غلط بھی ہے۔ اس قاعدے کے لحاظ سے ''کبھی بھی'' میں ''بھی'' غلط ہوگا، جیسے: ''وہ شخص کبھی بھی ہمارے علاقے سے نہیں گزرا۔'' اس میں ''بھی'' زائد ہے اور غلط بھی ہے۔

فوتگی۔ فوتیدگی:

فوت ہونا معروف ہے، یعنی کسی شخص کا مرجانا۔ فوت ہونا تو فعل ہے، جب کہ اس کا اسم یا حاصل مصدر وفات ہے، مگر معلوم نہیں ہو سکا کہ ''فوتگی'' اور ''فوتیدگی'' جو مرگ یا موت کے معنوں میں بعض لوگ استعمال کرتے ہیں، کہاں سے معرضِ وجود میں آئے۔

فوت کا لفظ اپنی ہیئت میں اشتقاق یا رد و بدل کا کوئی پہلو نہیں رکھتا۔ لوگوں نے اپنے ذوق سے فوتگی یا فوتیدگی کا (ناجائز) استعمال شروع کر رکھا ہے۔ یہ سراسر غلط ہے اور اردو یا فارسی کی کسی لغت میں اس ''بدعت'' کا وجود نہیں ہے۔ نیز ان میں عمدگی اور خوب صورتی کا بھی کوئی پہلو نہیں جو کسی کو اچھا لگے، ان سے اہلِ قلم کو پرہیز کرنا چاہیے۔

ناراضگی:

مولف نور اللغات کے مطابق ناراضگی عورتوں کی زبان ہے۔ جان صاحب،

جو عورتوں کی زبان میں شاعری کرتے تھے، ان کا ایک شعر بھی درج کیا ہے، لیکن اصل لفظ ''ناراضی'' ہے جس کا معنی ناخوشی اور رنجیدگی ہے۔ ''بھائی صاحب کی ناراضگی کے باعث میں فلاں کام نہیں کر سکا۔'' ناراضگی کے بجائے ناراضی لکھنا چاہیے۔ اسی طرح حیرانی کے بجائے حیرانگی لکھنا غلط ہے۔

فی زمانہ۔ فی زمانا:

کہا جاتا ہے: ''فی زمانہ لوگوں کا اخلاق بہت بگڑ گیا ہے۔'' یعنی ہمارے زمانے میں، حالانکہ ''فی زمانہ'' کا مطلب ہے زمانے میں۔ اصل مفہوم ''ہمارے زمانے میں'' کے لیے ''فی زمانا'' کہنا چاہیے، لیکن اس ترکیب کی ثقالت کے باعث بہتر ہے کہ ہلکے پھلکے الفاظ استعمال کیے جائیں اور کہا جائے: ''ہمارے زمانے میں'' یا ''آج کل'' یا ''ان دنوں'' وغیرہ۔
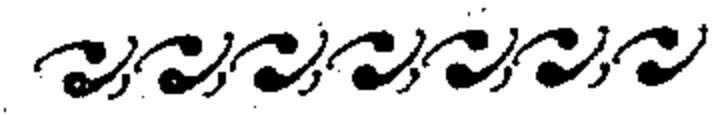
درآں حالے کہ۔ حالاں کہ:

''دراں حالے کہ (درآں حالیکہ) وہ خود عالم و فاضل ہے، اپنی اولاد کی تربیت کے لیے دوسرے عام شخص کو مقرر کر رکھا ہے۔''

یہ درست جملہ ہے، لیکن اگر ''دراں حالاں کہ'' لکھا جائے تو غلط ہوگا۔ حال آں کہ (عام املا حالانکہ) بھی اسی معنی میں مستعمل ہے، جس میں اوپر کا جملہ ہے۔

ایک جگہ ''دراں حالاں کہ'' کی املا نظر آئی، اس لیے ضرورت محسوس ہوئی کہ اس معروف مرکب کی تشریح کر دی جائے۔

کہ۔ بہ۔ سہ وغیرہ:

کہ: کہنا، بہ: بہنا اور سہ: سہنا (مصادر) کے افعال امر ہیں اور یہ سب دو حرفوں پر مشتمل ہیں۔ ان کی املا (لفظ ''املا'' کو بعض اہلِ زبان مذکر مانتے ہیں، لہٰذا مذکر اور مؤنث دونوں ٹھیک ہیں) میں دوسرا حرف ''ہ'' (ہائے ہوز) ہے۔ کچھ عرصے سے ان الفاظ کی املا یوں ہونے لگی ہے: کہہ، بہہ، سہہ وغیرہ۔ یہ سراسر غلط ہے، اس میں دو دفعہ ''ہ'' استعمال کرتے ہیں، جس کا تلفظ (ادا کرنا) سراسر تکلف (بلکہ تکلیف دہ) ہے۔ ان الفاظ کی پرانی املا: کہ، بہ، سہ وغیرہ ہی درست ہے۔

پُر کٹھن:

یہ لفظ پہلی دفعہ ایک جگہ عبارت میں نظر آیا۔ حیرت ہوئی کہ ''صاحبِ قلم'' نے کٹھن کے ساتھ ''پُر'' لگا کر ایک بھونڈی ترکیب وضع فرما دی ہے۔ لفظ ''پُر'' فالتو ہے، کٹھن ہی کافی ہے۔ یوں بھی ہندی اردو الفاظ کے ساتھ فارسی ''پُر'' وغیرہ لگا کر ترکیب بنانا غلط شمار ہوتا ہے، نیز اردو فارسی میں بھی اسم صفت کے ساتھ پُر لگانا معیوب ہے، جیسے کہا جائے: ''آج مجھے بہت ہی ''پُر سخت'' کام کرنا پڑا۔'' پُر ''اسماء'' کے ساتھ استعمال ہوتا ہے، جیسے پُردرد، پُرفضا، پُرفریب وغیرہ۔

چہل پہل:

(دونوں لفظ اکٹھے) رونق اور خوشی کے مظاہر کو کہا جاتا ہے، جب ہر طرف اجتماعی صورت میں کوئی تقریب منائی جا رہی ہو، مثلاً: ''کل شہر کے باہر سالانہ میلہ تھا جس میں دن بھر خوب چہل پہل رہی۔''

ایک جگہ (پہلی دفعہ) ان لفظوں کی ''جمع'' پڑھنے میں آئی، جیسے: ''فلاں کی شادی میں خوب چہلیں پہلیں تھیں۔'' ایسے مرکبات کی جمع نہیں ہوتی۔ ہمارے ہاں (پنجابی انداز میں) اس قسم کے الفاظ وضع کیے جاتے ہیں، مثلاً: ''بھئی واہ! اج تاں ایتھے وڈیاں رونقاں لگیاں نیں۔'' رونق بھی اردو میں ''جمع'' استعمال نہیں ہوتا۔ یہی صورت چہل پہل کی ہے۔

حروف ''ہی'' کا استعمال:

''ہی'' حرفِ حصر ہے جو کسی اسم یا امر کے ساتھ اس وقت لگایا جاتا ہے جب اس پر زور دینا مقصود ہوتا ہے، مثلاً: ''آپ ہی نے مجھے وہاں بھیجا، ورنہ

میرا وہاں جانے کا کوئی ارادہ نہ تھا۔''

اس میں ''ہی'' کو ''آپ'' کے ساتھ لکھا جائے گا۔ ''آپ نے ہی'' لکھنا غلط ہوگا۔ ''آپ کا وہاں جانا ہی ضروری تھا، ورنہ پیغام بھیجنے سے کام نہ ہوتا۔'' یہاں جانا پر زور ہے۔

جان کاری:

آج کل یہ ہندی مرکب (جان کاری) بڑا عام ہو رہا ہے۔ یہ جاننے یا معلوم کرنے یا سیکھنے کے معنوں میں اہلِ ہند نے (حال ہی میں) وضع کیا ہے جو ہمارے نقطہ نگاہ سے غلط ہے۔ جان کا لفظ جاننا (مصدر) سے مشتق ہے اور کاری (فارسی) لگا کر جاننے اور سیکھنے کے عمل کے معنوں میں استعمال ہو رہا ہے۔ ہمارے ہاں لفظ تعلیم، تدریس، تفہیم وغیرہ موجود ہیں اور مسلمانوں کی اردو زبان میں سو ڈیڑھ سو سال سے جاری ہیں۔ ہندی الفاظ سے ''محبت'' کے شوق میں اپنی زبان کو نظر انداز کرنا ناشکری اور اغیار کی نقالی ہے۔

آئے دن۔ آئے روز نہیں:

''آئے دن'' اردو زبان کا معروف ''روز مرہ'' ہے۔ یہ ایسے موقع پر بولا جاتا ہے جب کوئی امر دو چار دن کے وقفے سے بار بار واقع ہو رہا ہو، مثلاً: ''فلاں شخص آئے دن گلی میں اودھم مچاتا ہے اور کسی نہ کسی سے الجھتا رہتا ہے۔'' یعنی یہ واقعہ ہر روز نہیں، چند روز کے وقفے سے برپا ہوتا ہے۔

بعض دوستوں نے ''آئے دن'' کو ''آئے روز'' میں بدل دیا ہے جو سراسر غلط ہے۔ ''آئے'' اردو لفظ ہے اور ''روز'' فارسی۔ ان کو ایک ترکیب

میں جمع نہیں کیا جا سکتا، نیز زبان کے محاورے اور روز مرے جن الفاظ میں مرتب ہو چکے ہیں، ان میں کوئی لفظی تبدیلی نہیں کی جا سکتی، خواہ اس کے تبدیل شدہ الفاظ اسی زبان کے ہوں، مثلاً: ''ہاتھ کنگن کو آرسی کیا'' اس کے بجائے ''ہاتھ کڑے کو شیشہ کیا'' غلط ہو گا اور وہ محاورہ نہیں ہو گا، خواہ اس کی معنویت وہی ہو جو خود محاورے کی تھی۔ یہی صورت روز مرے کی ہے، لہٰذا ''آئے دن'' کو ''آئے روز'' کہنا اور لکھنا درست نہیں۔

نت نئے روز:

ابھی ''آئے دن'' کے بجائے ''آئے روز'' کا ٹنٹا ختم نہیں ہوا کہ ہمارے ایک فاضل مدیر نے ''نت نئے روز'' کا روز مرہ یا محاورہ ڈھونڈ نکالا یا شاید وضع کر لیا ہے۔ لکھتے ہیں: ''نت نئے روز نت نئی توضیحات جنم لیتی ہیں۔'' ''نت نئے روز'' نے زبان کا دیوالا نکال دیا۔ میری معلومات کی حد تک وہ حضرت پنجاب ہی کے رہنے والے ہیں اور پنجابی میں ''نت'' کے معنی ''ہر روز'' ہیں۔ اس لحاظ سے ''نت'' کے بعد ''نئے روز'' کا اضافہ سراسر ''زیادتی'' ہے۔

سوالیہ جملے اور سوالیہ نشان:

اردو عبارت آرائی میں سوالیہ جملے بھی دوسری زبانوں ہی کی طرح مستعمل ہیں اور ان کے لیے سوالیہ حروف (حروفِ استفہام) بھی مقرر ہیں، مثلاً: کیا، کب، کیوں، کہاں، کون، کس، کدھر اور کیسے وغیرہ۔

یہ حروف جملے کے شروع میں یا اندر کسی مناسب جگہ لکھے جاتے ہیں، مثلاً:

① کیا آپ نے فلاں کام مکمل کر لیا ہے؟

② آپ شہر سے کب واپس آئے؟

③ اسلم نے آپ کو اپنی شادی پر کیوں نہیں بلایا؟

④ آپ کے بڑے بھائی کہاں رہتے ہیں؟

ایسے جملوں میں حروفِ استفہام کے علاوہ آخر میں سوالیہ نشان (؟) بھی لگایا جاتا ہے، جیسے اوپر کے جملوں کے آخر میں نظر آتا ہے اور حروفِ استفہام وہ ہیں جن کے اوپر خط لگایا گیا ہے۔

ہمارے ہاں پنجابی بول چال میں ایک لہجہ ایسا بھی ہے کہ وہ جملہ سوالیہ ہوتا ہے، مگر اس میں کہیں حرفِ استفہام نہیں ہوتا، مثلاً: ''میں نے تمھیں کہا تھا کہ دفتر مت جانا؟''

اس میں ''کہا تھا'' کو قدرے زور سے ادا کرنا اور کچھ گردن اور سر کو بھی

جنبش دینا جملے میں استفہام پیدا کرتا ہے۔ نیز ''کہا تھا'' میں کچھ درشتی اور خفگی بھی شامل ہوتی ہے۔ ہمارے بعض اہلِ قلم لکھنے میں بھی ایسے جملے اسی طرح (بغیر حرفِ استفہام) لکھ دیتے ہیں اور آخر میں سوالیہ نشان لگا دیتے ہیں۔ تحریر میں یہ انداز ہرگز استعمال نہیں کرنا چاہیے۔ وہاں حرفِ استفہام کا استعمال ضرور کرنا چاہیے۔ علاوہ ازیں ''تمھیں کہا'' بھی غلط ہے۔ اس کے بجائے ''تم سے کہا'' درست ہوگا۔

متذکرہ جملہ دو طرح لکھا جا سکتا ہے، مثلاً:

① کیا میں نے تم سے کہا تھا کہ دفتر مت جانا؟

② میں نے تم سے کب کہا تھا کہ دفتر مت جانا؟

دونوں فقروں میں حروفِ استفہام بالترتیب ''کیا'' اور ''کب'' ہیں، جن کا لکھنا ضروری ہے۔ نیز ''کہنا'' سے پہلے حرفِ جار ''سے'' لازم ہے۔

پایہ۔ پا (پائے):

فارسی کے دو الفاظ ''پا'' اور ''پایہ'' باہم مترادف معلوم ہوتے ہیں، حالانکہ دونوں کے معانی مختلف ہیں۔

''پا'' بہ معنی پاؤں ہے جس کو کسی مرکب میں استعمال کرتے وقت ''پائے'' لکھنا ہوتا ہے، جیسے پائے استقلال (مضبوطی کا پاؤں)۔ اس کا استعمال بھی یوں ہوتا ہے: قوم کے قائد کی اصل خوبی یہ ہے کہ جب وہ کوئی فیصلہ کرے تو مخالفتوں اور مشکلوں کے باوجود اس کے پائے استقلال میں جنبش (یا لغزش) نہ آئے یا لرزش پیدا نہ ہو۔

دوسرا لفظ ''پایہ'' ہے جس پر ''پائے'' کا اشتباہ ہوتا ہے اور ہمارے بہت سے نئے انشا پرداز (جو فارسی سے عموماً نابلد ہوتے ہیں) پائے استقلال کے بجائے پایۂ استقلال لکھ رہے ہیں۔ ''پایہ'' کا معنی درجہ اور رتبہ ہے، اس لیے اس کا متذکرہ استعمال غلط ہے۔

پایہ پاؤں کے معنوں میں بھی مستعمل ہے، مگر آدمی یا جانور کے پاؤں نہیں، بلکہ پلنگ یا تخت کے پاؤں جنھیں پنجابی میں ''پاوا'' کہتے ہیں۔ پلنگ یا تخت کے ساتھ یوں استعمال ہوتا ہے: ''میرے پلنگ کا پایہ ٹوٹ گیا تو نیا بدلنا پڑا۔'' رتبہ اور درجہ کے لیے یوں استعمال ہوتا ہے: ''فلاں شخص سرکاری محکمے میں بلند پایہ منصب پر فائز ہے۔'' تخت کے ساتھ یوں ہے: ''دہلی کا شہر مدتوں مغل بادشاہوں کا پایۂ تخت (دارالسلطنت) رہا۔''

سب سے اولین:
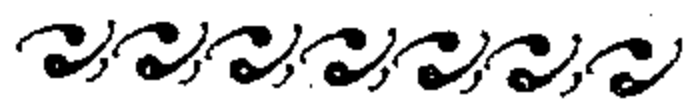
کسی زبان کی گرامر میں اسماء کے بیان میں اسمِ صفت ایک نہایت اہم رکن ہے۔ یہ انسان، حیوان اور دیگر اشیاء کی صفات کا بیان ہے جو اچھا یا برا پہلو رکھتا ہے۔ ان صفات کی درجہ بندی اسم تفضیل سے ہوتی ہے۔ یہ صفات کو تین حصوں میں تقسیم کرتا ہے۔ یعنی تفضیلِ نفسی، تفضیلِ بعض اور تفضیلِ کل۔

یہ تقسیمِ صفات ہر زبان میں پائی جاتی ہے۔ ہمارے ہاں اردو میں فارسی اور عربی گرامر کی پیروی کی جاتی ہے، اس لیے عنوانات کے نام عربی ہی میں ہیں۔ ان کی تشریح مختصراً یوں ہے:

① تفضیلِ نفسی: ایک شخص کی خوبی جو اس کی ذات تک محدود ہوتی ہے، مثلاً: اسلم اچھا آدمی ہے۔ (''اچھا'' اسمِ صفت ہے)

② تفضیلِ بعض: دوسروں کے مقابلے میں کسی ایک شخص کی خوبی بیان کرتے ہوئے کہا جاتا ہے: ''وہ فلاں سے اچھا ہے'' یا ''وہ بہت اچھا آدمی ہے'' یعنی لفظ ''فلاں سے'' یا ''بہت'' لکھنے سے اس شخص کی دوسروں پر فضیلت واضح ہوئی۔

③ تفضیلِ کل: اس میں ایک آدمی کو تمام لوگوں سے اچھا بتانے کے لیے کہتے

ہیں: ''وہ سب سے اچھا آدمی ہے۔'' یا ''بہت ہی اچھا آدمی ہے۔'' گویا بہت کے ساتھ ''ہی'' لگ گیا، جس سے بڑھ کر اچھائی کا کوئی اور درجہ باقی نہیں رہتا، یعنی آخری حد کی اچھائی ہے۔

اردو میں فارسی کا تتبع کیا جاتا ہے، اس لیے صفات کے درجات کو یوں بیان کرتے ہیں: فارسی: بہ، بہتر، بہترین (اچھا، بہت اچھا، بہت ہی اچھا)۔ کم، کم تر، کم ترین، (تھوڑا، بہت تھوڑا، بہت ہی تھوڑا) وغیرہ۔

ہمارے بعض اہلِ قلم تفضیلِ کل کے سلسلے میں یہ غلطی کرتے ہیں کہ صفت کا تیسرا درجہ بھی لکھتے ہیں اور اس کے ساتھ ''سب سے'' بھی لکھتے ہیں، مثلاً: ''فلاں شخص اپنی مصنوعات کا نمونہ لایا جو مقابلے میں سب سے بہترین قرار پایا۔''، ''جمعہ کے دن فلاں شخص مسجد میں پہنچنے والا سب سے اولین نمازی تھا۔'' دونوں فقروں میں ''سب سے'' کے الفاظ غیر ضروری ہیں۔

بھڑکانا۔ بھٹکانا:

یہ دونوں مصادر بہ ظاہر مختلف معنی رکھتے ہیں، لیکن بعض دوست انھیں آپس میں گڈ مڈ کر جاتے ہیں، مثلاً: ''اسلم اور انور کے خاندان پہلے ہی آپس میں لڑتے بھڑتے رہتے ہیں، لیکن اب فلاں شخص نے لگائی بجھائی کر کے ان کے درمیان دشمنی کے شعلے اور بھٹکا دیے۔''

بھٹکانا دراصل کسی کو راستے سے گمراہ کر دینا اور اس کے ارادے میں خلل ڈال کر دوسری طرف پھیر دینا ہے۔ شعلے کو بھٹکایا نہیں، بھڑکایا جاتا ہے۔ اس لیے جملے کے آخری حصے کو یوں ہونا چاہیے: ''دشمنی کے شعلے اور بھڑکا دیے۔''

انگریزی الفاظ کی جمع:

انگریزی کے بہت سے الفاظ اردو میں عام مستعمل ہیں اور وہ زبان میں اتنے رچ بس گئے ہیں کہ وہ اردو ہی کے معلوم ہوتے ہیں اور ہم ان کی جمع بھی اپنے اردو طریقے سے کرتے ہیں، مثلاً: سکول کی جمع سکولوں، سٹیشن کی جمع سٹیشنوں، ہال (بڑا کمرہ) سے ہالوں، ہسپتال سے ہسپتالوں، ریل سے ریلوں اور ٹرین سے ٹرینوں وغیرہ۔

ہمارے بعض اہلِ قلم (جو غالباً تھوڑی بہت انگریزی پڑھ یا سن لیتے ہیں اور خود کو انگریزی دان باور کرانا چاہتے ہیں) ایسے اردو میں مستعمل الفاظ کی جمع میں انگریزی کے طریقِ جمع کے مطابق حرف ''ز'' کو دانستہ استعمال کرتے ہیں، مثلاً: سکولز، ہابیز، سٹیشنز، ہالز اور ریلز وغیرہ۔

ان خدا کے بندوں سے گزارش ہے کہ ہمارے بزرگوں نے جن الفاظ کو اردو میں قبول کر لیا اور ان پردیسیوں کو اپنے ہاں پناہ دی ہے، انھیں ہماری ہی تہذیب میں شامل رہنے دیں، دوبارہ ان کو انگریزی زبان کی گرامر سے بوجھل یا اجنبی مت بنائیں، نوازش ہوگی!

آج کل کے نوجوان انگریزی سے اتنے متاثر یا مرعوب ہیں کہ ہر جملے کا آدھا یا کمتر حصہ انگریزی میں بولتے ہیں اور آنکھوں اور گردن کو بھی ویسی ہی حرکت دیتے ہیں۔ ایسا کرنے سے انگریزی یا انگریزی زبان کو تو ان کی اس ''چاپلوسی'' سے کوئی خوشی نہیں ہوتی، البتہ ہماری اپنی زبان اور تہذیب کی تضحیک ضرور ہوتی ہے۔ ان لوگوں کو اپنی ''خودی'' پہچاننی چاہیے...!!

صاحبزادہ۔ صاحبزادی:

ایامِ ملوکیت میں بڑے لوگوں کی اولاد کے احترام میں انھیں صاحبزادہ یا صاحبزادی کہا جاتا تھا۔ انھیں فلاں کا بیٹا یا فلاں کی بیٹی کہنا ان کی ''سبکی'' شمار ہوتا تھا۔ یہ لفظ اب بھی یہاں مستعمل ہے اور بعض لوگ اپنے والد یا دادا کے کسی مسلمہ مقام کے حوالے سے خود کو صاحبزادہ لکھتے ہیں اور اسے معاشرے میں اپنی بلند حیثیت کا نشان تصور کرتے ہیں، حالانکہ یہ سراسر ''پدرم سلطان بود'' کے جھوٹے وقار کا مظاہرہ ہے۔ ہر شخص کو اپنا مقام خود (اپنی قابلیت سے) بنانا چاہیے۔ جیسے نظامی گنجوی نے بیٹے سے کہا تھا ؎

جائے کہ بزرگ بایدت بود
فرزندی من نداردت سود

''جہاں تجھے بڑائی کی آرزو ہے وہاں میرا بیٹا ہونا تیرے کسی کام نہیں آئے گا۔''

یعنی تجھے اپنی خوبیوں ہی سے بلند مقام مل سکے گا۔ اس جملہ معترضہ سے قطع نظر اس ''لقب'' کا استعمال لوگ اپنے لیے خود ہی کر رہے ہیں، حالانکہ دوسرا شخص اگر کسی کے ساتھ بچہ دیکھ کر کہے: کیا یہ آپ کا صاحبزادہ ہے؟ تو اس سے آدمی کی عزت میں اضافہ ہوتا ہے، لیکن جب وہ خود یہ کہے کہ یہ میرا صاحبزادہ ہے تو یہ خودستائی شمار ہوگی۔

ایک لطیفہ:

اس پر ایک لطیفہ یاد آیا۔ مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری رحمہ اللہ کے ساتھ ان کا

بیٹا ابوذر بخاری تھا۔ ایک عقیدت مند نے ازراہِ احترام کہا: شاہ جی! کیا یہ آپ کا صاحبزادہ ہے؟ تو بولے: نہیں جناب! صاحبزادہ نہیں میرا پتر اے۔ (صاحب سے مراد وہ انگریز لیتے تھے، جس سے وہ بے حد نفرت بھی کرتے تھے)۔ ''صاحبزادے'' کے معاملے میں شاہ جی نہایت غیور تھے۔
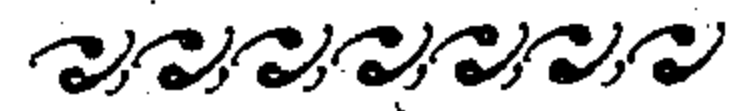
معرکہ آرا۔ معرکہ آرائی ۔ معرکۃ الآراء:

اردو زبان و بیان کی اَغلاط میں ایک لفظ (مرکب) معرکۃ الآرا بھی ہے جو فارسی مرکب ہے، عربی نہیں، اس لیے معرکہ آرا لکھا جانا چاہیے، معرکۃ الآراء نہیں۔ اقبال کا مصرع ہے ؎

تھے ہمیں ایک ترے معرکہ آراؤں میں

یہ مرکب عموماً کسی کتاب کی اہمیت، خوبی یا قابلِ ذکر مرقع کے معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے، مثلاً: ''حال ہی میں تعلیمی نصاب پر ایک معرکہ آرا کتاب (بعنوان فلاں) شائع ہوئی ہے۔'' اس مرکب کو کچھ عرصے سے معرکۃ الآراء بنا دیا گیا ہے۔ یہ تو معلوم نہیں یہ کب سے ہوا ہے (ریکارڈ سامنے نہیں) لیکن یہ معلوم ہے کہ قیامِ پاکستان کے اولین عشرے تک یہ ''معرکہ آرا'' ہی تھا، اب اس کو ''معرکۃ الآراء'' بنا دیا گیا ہے۔

قارئین غور فرمائیں کہ معرکہ آرا (فارسی مرکب) کو عربی میں منتقل کرنے سے اس کی معنویت کیا بنتی ہے۔ معرکہ آرا اپنے لغوی معنوں میں جنگ لڑنے کے لیے ہماری تاریخ کی کتابوں میں صدیوں سے مستعمل ہے، جیسے: ''مغل بادشاہ بابر فلاں سن میں تراوڑی کے میدان میں رانا سانگا سے معرکہ آرا ہوا۔

مقابلہ سخت تھا اور بابر نے اس دن اپنے بہادروں کے سامنے جوش و جذبہ ابھارنے کے لیے تقریر کی اور ساتھ ہی اس دن شراب نوشی سے توبہ کا اعلان کیا....''

لفظ ''آرا'' فارسی مصدر آراستن (سجانا) سے امر کا صیغہ ہے۔ دوستوں نے جب اس کو عربی کا لباس پہنایا تو املا میں معرکۃ الآراء لکھتے ہوئے آخر میں ہمزہ کا بھی اضافہ کیا ہے۔ اب اس (معرکۃ الآراء) کا لغوی معنی ہوا: مختلف احباب کی رایوں کا باہمی جھگڑا۔ (کیوں کہ آرا، رائے کی جمع ہے)۔

اہلِ لغت کی ستم ظریفی بھی دیکھیے کہ انھوں نے بھی اب (پہلے نہیں تھا) معرکہ آرا۔ معرکۃ الآرا کو ایک ہی سطر میں لکھ کر معنی لکھے ہیں: (عربی، صفت) صف آور، جنگ آور، جنگجو، زبردست، زور آور، معرکے کو رونق دینے والا (فیروز اللغات اردو جامع نیا اِڈیشن) اس سے واضح ہے کہ یہ تمام معانی معرکہ آرا کے ہیں، معرکۃ الآراء کے نہیں۔

نیچے دیے ہوئے معرکہ آرائی کے معنی اوپر کے معانی کے مصدری معنی ہیں اور معرکہ آرائی معرکہ آرا کا حاصل مصدر ہے۔ اب ان سے دریافت کیجیے: ''معرکہ آرائی'' کی طرح ''معرکۃ الآراء'' کا حاصل مصدر کیا ہے؟ نیز کسی چیز کی اہمیت وعظمت کے لیے جب معرکۃ الآراء کہا یا لکھا جائے گا تو کیا اس کا معنی وہی ہوگا جو مطلوب ہے یا آرا کا باہم جھگڑا؟

ہمارا خیال ہے کہ فیروز اللغات کے موجودہ (جدید) اڈیشن سے پہلے کے اڈیشنوں میں معرکۃ الآراء نہیں ملے گا۔ نیز فیروز اللغات (فارسی) میں

صرف معرکہ آرا ہے، معرکۃ الآراء نہیں۔ اردو اڈیشن میں اس کو ''عربی'' لکھا ہے، جب کہ عربی لغات میں سرے سے یہ لفظ موجود نہیں ہے۔ فرہنگِ آصفیہ بھی اس سے تہی دامن ہے۔

تولید۔ ولادت:

اَغلاط کی نشاندہی پر بعض لوگ خفا ہو جاتے ہیں، حالانکہ ہر اہلِ علم کسی نہ کسی مقام پر غلطی کا مرتکب ہو سکتا ہے۔ گذشتہ دنوں راقم الحروف نے ایک کتاب کے تبصرے میں ایک جملہ لکھا تھا، جس میں کسی شخص کی ''ولادت و وفات'' لکھنے کے بجائے ''تولید و وفات'' لکھ دیا۔ ایک کرم فرما نے اس غلطی کی نشاندہی فرمائی کہ تولید کے بجائے ولادت ہونا چاہیے۔ تولید کے معنی پیدا کرنا ہے، پیدا ہونا نہیں۔ راقم کو اس غلطی کے اعتراف میں ذرہ بھر ملال نہیں ہوا، بلکہ فوراً ان کرم فرما کے لیے اظہارِ تشکر کیا اور اپنی اصلاح کر لی۔

فی صد (%) کا نشان:

بعض دوست فی صد کو فی صدی بولتے اور لکھتے ہیں، اور اس کے ساتھ اس کا نشان (٪) لکھتے ہیں۔ یہ نشان حساب کے سوال حل کرتے وقت یا کوئی جدول پیش کرتے وقت ہندسوں کے ہمراہ لکھا جاتا ہے اور وہ بھی اردو کی طرح دائیں سے بائیں نہیں، بلکہ حساب کی طرح بائیں سے دائیں لکھا جاتا ہے، مثلاً:

10٪، 15٪، 20٪ وغیرہ۔

عبارت میں 10٪، 20٪، وغیرہ لکھنا غلط ہے، اس کے لیے عبارت (الفاظ میں) ہی لکھیے، یعنی دس فی صد، بیس فی صد وغیرہ۔ نیز عدد سو (١٠٠)

کے لیے صد کو صدی نہیں کہنا چاہیے۔ ''فی صدی'' غلط ہے، کیونکہ صدی صرف سو سال کی مُدت کے لیے مستعمل ہے۔ اپنے مفروضہ دفاع میں کرکٹ کی سنچری (Century) کو بیچ میں مت لائیے۔

انگریزی زبان سے محبت یا مرعوبیت؟

ہمارے معاشرے میں آج کل انگریزی زبان اور انگریزی طرزِ بود و باش کو بہت اہمیت دی جا رہی ہے۔

حیرت ہے قفس سے ہوئے آزاد تو پھر بھی
مرغوب وہی دانہ وہی دام ہوا ہے

نوجوان لڑکوں، لڑکیوں کی گفتگو میں چند اردو یا پنجابی جملوں کے بعد نہایت بے تکلفی سے باقی بات انگریزی میں کی جاتی ہے۔ اہلِ قلم کے مضامین کی عبارتوں میں انگریزی الفاظ تکلفاً استعمال کرنے کا رواج بڑھ رہا ہے، حالانکہ اردو میں ان الفاظ کے لیے متبادل الفاظ موجود ہوتے ہیں۔

راقم الحروف کی نظر میں انگریزی کا لفظ وہاں استعمال کرنا چاہیے، جہاں ہماری زبان کا کوئی متبادل لفظ موجود نہ ہو اور انگریزی کا لفظ عام ہو، یعنی پہلے سے بولا اور سمجھا جاتا ہو، مثلاً: ''میرا موڈ ٹھیک نہیں۔''، ''آج ہماری میٹنگ ہے۔'' ایسے ہی بے شمار الفاظ ہیں، مثلاً: کالج، یونیورسٹی، سکول، ائیر پورٹ، ریلوے اسٹیشن، ریڈیو، ٹی وی، ٹرین، ہسپتال، بورڈنگ ہاؤس، پوسٹ آفس، بنک، ریسٹ ہاؤس، ہوٹل، سینما، کار، رکشا، بائیسکل، موٹر سائیکل، بس اور بس سٹاپ، ٹرک، بلڈوزر، رُولر، ٹریفک، روڈ، بائی پاس وغیرہ (بے شمار الفاظ

ہیں، جن کا متبادل ہمارے ہاں نہیں ہے۔ اگر ہے تو ان الفاظ کی عمومیت یا ان کا چلن زیادہ ہو گیا ہے، مثلاً شفا خانہ کے بجائے ہسپتال زیادہ عام ہے۔ دار العلوم یا جامعہ کے بجائے یونیورسٹی اور کالج وغیرہ زیادہ زبان زدِ عوام ہیں اور عام بول چال میں اب وہ اجنبی نہیں رہے۔

اس تفصیل کا مقصد یہ ہے کہ ہمیں اپنی زبان کو اہمیت دیتے ہوئے ایسے انگریزی الفاظ سے پرہیز کرنا چاہیے، جن کے متبادل الفاظ ہمارے ہاں موجود ہیں۔

اس سلسلے میں یہ بھی یاد رہے کہ عام مستعمل انگریزی الفاظ جب ہم جمع کے صیغے میں بولیں گے تو ان کی وہی جمع درست ہو گی جو ہماری زبان کے قواعد میں موجود ہے، مثلاً سکول کی جمع انگریزی میں تو سکولز ہوتی ہے، مگر ہم ''سکولوں'' کہیں گے تو یوں بولیں گے کہ ''ہمارے سکول اور ہسپتال بہت عمدہ طریقے سے چل رہے ہیں۔'' انگریزی طریقے کی جمع مناسب نہیں ہے، یعنی سکولز، ہاسپٹلز وغیرہ کا تکلف فضول ہے۔

آف (کا، کے، کی):

آف (of) ایک انگریزی حرفِ جار ہے جو کا، کے، کی کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ یہ انگریزی جملوں میں عام استعمال ہوتا ہے۔ اردو میں لوگوں نے اب اشخاص کی ''نسبتِ شہری'' کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیا ہے، یعنی چودھری محمد دین آف پسرور، وغیرہ۔ یہ نہایت بھونڈا طریقہ ہے۔ ہمارے ہاں اس کے لیے یائے نسبتی کا معزز طریقہ موجود ہے، یعنی چوہدری محمد دین پسروری، رانا شکیل احمد قصوری، وغیرہ۔ انگریزی الفاظ کا تکلفاً استعمال یا تو ہماری مرعوبیت

ہے یا اپنی انگریزی دانی کا جھوٹا مظاہرہ ہے۔[1] اکبر الٰہ آبادی نے ایک خاتون کی زبانی کیا خوب کہا ہے ؎

خود تو گٹ پٹ کے لیے جان دیے دیتے ہیں
مجھ پہ قدغن ہے کہ پڑھ بیٹھ کے قرآن مجید

جائداد:

جائداد مشہور لفظ ہے، جو کسی کی مالی یا دوسری ملکیت کے لیے مستعمل ہے۔ اس کی املا وہی درست ہے جو اوپر دی گئی ہے۔ بعض لوگ جائیداد لکھتے ہیں جو غلط ہے۔

روداد:

روداد: کہانی، داستان یا واقعے کو کہتے ہیں، جیسے ؎

قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہو جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو
(غالبؔ)

اس لفظ کی املا وہی ہے جو اوپر درج کی گئی ہے۔ بعض لوگ اسے ''روئیداد'' لکھتے ہیں جو غلط ہے۔

کاٹ چھانٹ:

ان دونوں الفاظ کے مصادر کاٹنا اور چھانٹنا ہیں، ان میں سے کاٹ کو اکثر لوگ چھانٹ کی نسبت سے کانٹ لکھتے ہیں۔ ''کانٹ چھانٹ'' صریحاً غلط ہے۔

---

[1] اس سلسلے میں ''نواب آف کالا باغ'' گورنر پنجاب ملک امیر محمد خان کے لیے تاریخی طور پر مستعمل اور مشہورِ عام ہے، لہٰذا اس کے استعمال میں کوئی حرج نہیں۔

اس کی املا کاٹ چھانٹ ہے، کانٹ چھانٹ نہیں!

گالی نکالنا۔ آواز مارنا۔ جوتا، قمیص ڈالنا:

اکثر دوست اپنی تحریر میں گالی کے ساتھ ''نکالنا'' کا لفظ استعمال کرتے ہیں، یہ پنجابی بول چال میں تو عام ہے، مگر اردو میں نکالنا کے بجائے ''گالی دینا'' لکھنا چاہیے۔

اسی طرح آواز مارنا بھی غلط ہے، وہاں آواز دینا ٹھیک ہے اور جوتا یا قمیص یا کپڑے ڈالنا بھی غلط ہے۔ جوتا اور کپڑے پہننا درست ہے۔

آئی ہوئیں۔ گئی ہوئیں:

اردو عبارات میں فعل ماضی قریب و بعید کے جملوں میں صیغہ مؤنث کے لیے جہاں ہوا، ہوئے، ہوئی استعمال ہوتا ہے، اس کی مختلف صورتیں ہوتی ہیں:

① اجلاس میں بہت سی خواتین بھی آئی ہوئی ہیں (یا) تھیں۔

② کل کے اجلاس میں چند ہی خواتین تشریف لائیں۔

جملہ ① کی صورت میں ''ہوئی'' کی جمع ''ہوئیں'' لکھنا غلط ہے، یعنی خواتین بھی ''آئی ہوئیں ہیں'' یا ''آئی ہوئیں تھیں۔'' درست نہیں۔ بعض احباب آئی ہوئی دونوں کو جمع لکھ دیتے ہیں، یعنی آئیں ہوئیں تھیں یا آئیں ہوئیں ہیں۔ یہ بالکل غلط اور بدنما جملہ ہے۔

جملہ ② میں آخری جزوِ فعل (ہیں یا تھیں) موجود نہیں۔ اس لیے فعل ''لائی'' کی جمع لائیں لکھنا درست، بلکہ لازم ہوگا۔

الفاظ کی خودساختہ جمع:

بعض محکموں کے اشتہاروں یا سرکاری نوٹس کے مضامین میں بعض الفاظ کو جمع لکھنے میں خود ساختہ طریقہ استعمال کیا جاتا ہے، ان میں خصوصاً محکمہ تعمیرات میں سڑکوں کو سڑکات، شاہراہوں کو شاہرات لکھا جاتا ہے جو قواعد کے سراسر خلاف ہے۔

''ات'' کے اضافے سے افعال و اسماء کی جو جمع عموماً نظر آتی ہے، وہ فارسی الفاظ کی ہوتی ہے، ہندی یا اردو الفاظ کی جمع کا یہ طریقہ ہرگز مستعمل نہیں۔ سڑک کی جمع سڑکوں (بطور اردو) ہی مناسب ہے۔ شاہ راہ کو فارسی لفظ کی صورت میں ''ات'' کا مستحق تو قرار دیا گیا ہے، مگر یہ نہیں دیکھا جاتا کہ شاہرات تو ''شاہر'' کی جمع ہوئی، شاہراہ کی نہیں۔ کوئی شخص (صاحبِ علم) راہ کی جمع ''رات'' نہیں لکھے گا۔

فارسی میں جمع کے لیے ''ات'' کے علاوہ ''ہا'' کا لاحقہ مستعمل ہے، جیسے: کوزہ ہا، دریا ہا وغیرہ۔ اسی طرح شاہراہ کے مکمل لفظ کے بعد ''ہا'' لگایا جائے گا اور اس کی جمع شاہراہ ہا ہوگی، لیکن اس تکلف میں پڑنے کے بجائے اردو میں اس لفظ کے عام استعمال کے باعث بطریقِ اردو ہی جمع لکھنی چاہیے، یعنی شاہراہیں، شاہراہوں وغیرہ۔

اس سلسلے کی ایک نئی جمع آئی ہے، یعنی کسی امتحان کے نتائج بیان کرتے ہوئے ایک صاحب نے تحریر فرمایا: ''ہمارے تمام لڑکے بہت اچھے نمبرات لے کر پاس ہوئے۔''

''نمبرات'' انگریزی لفظ ''نمبر'' کی جمع بنائی گئی۔ یہ (نمبر) بھی اُسی قبیل سے ہے جیسے اردو، ہندی الفاظ کی جمع اوپر بیان کی گئی۔ اس لفظ کو بھی اردو میں ایک مقام مل چکا ہے، اس لیے اس کی جمع بھی اردو قواعد کے مطابق ''نمبروں'' ہوگی۔ یعنی اچھے نمبروں سے پاس ہوئے۔ اگر اس کی جمع نہ بھی لکھی جائے تو ''اچھے نمبر لے کر پاس ہوئے'' درست ہوگا۔

بند۔ بندھن:

دونوں الفاظ اردو میں قریب المعنی ہیں، لیکن ان کے مقاماتِ استعمال میں فرق ہے۔ ''بند'' وہ روک ہے جس سے کسی حرکت کو روکا جائے، مثلاً: رسی سے کسی چیز کو باندھ دیا، بہتے ہوئے پانی کے آگے مٹی سے بند باندھ دیا۔ جذبات کے اظہار کو روکنے کے لیے بھی صبر کا بند باندھ دیا (محاورتاً) لیکن ''بندھن'' دو الگ اجسام کو آپس میں اکٹھا کرنے کا نام ہوگا، جیسے: شادی، میاں بیوی کے درمیان ایک بندھن ہے۔ رشتے داروں کے درمیان آپس میں متبرک رشتوں کا بندھن کہلاتا ہے۔ دو فریقوں کا باہم کوئی معاہدہ کرنا بھی بندھن ہوگا۔

ان کا استعمال یوں ہوگا:

بند: ہم نے سیلاب کے امکانی طوفان کے مقابلے کے لیے بڑے بڑے بند باندھ دیے ہیں۔ قیدیوں کو جیل میں بند کر دیا گیا۔ بارش بند ہوگئی ہے۔
گویا اس لفظ کو بیشتر طریقوں سے استعمال کیا جا سکتا ہے۔

بندھن: ہم نے فلاں رشتے دار سے اپنا بندھن توڑ دیا ہے۔ فلاں شخص نے بیوی کو طلاق دے کر بندھن سے خلاصی پالی۔

جذبات کو روکنے کے لیے بند کا استعمال ہوگا، یعنی ''والدِ گرامی کی اچانک وفات سے اتنا جھٹکا لگا کہ میرے صبر کے تمام بند ٹوٹ گئے۔'' یہاں ''صبر کے بندھن ٹوٹ گئے۔'' غلط ہوگا۔ ایسے جملوں میں بندھن استعمال نہیں ہوتا۔

یہ ممکن ہوسکتا ہے:

یہ جملہ غلط ہے، ممکن کے لفظ میں ''ہوسکتا'' کا مفہوم موجود ہے، اس لیے جملہ یوں ہوگا: یہ بھی ممکن ہے۔ یہاں ''ہوسکتا'' زائد ہے۔

ایک جملے میں واحد اور جمع کا استعمال:

ایک ہی جملے میں جب دو اسماء کا ذکر ہوگا تو وہ دونوں یا تو واحد لکھے جائیں یا جمع، نیز جمع بھی اگر الفاظ عربی فارسی ہیں تو ان کے مطابق ہوگی اور اگر اردو ہندی ہوں گے تو ان کے مطابق، مثلاً:

''ان دنوں اخبارات و رسائل میں مہنگائی پر خوب لے دے ہو رہی ہے۔'' اگر ہم چاہیں تو ان کو اردو کے طریقے سے جمع بنا سکتے ہیں، مثلاً: ''ان دنوں اخباروں اور رسالوں میں ...!''

لیکن یاد رہے کہ دونوں کی جمع ایک ہی طریقے سے ہوگی، جیسے اوپر مثالیں دی گئیں۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ ہم یوں لکھیں: ''ان دنوں اخبارات اور رسالوں میں ...!'' یا ''ان اخباروں اور رسائل (یا رسالہ جات) میں''.... یہ قواعد کی رُو سے غلط ہوگا۔

ہم معنی یا مترادف الفاظ کے مرکب:

بعض اہلِ قلم الفاظ کی بھر مار کرنے اور ثقیل الفاظ کے استعمال سے عبارت آرائی کے زعم میں مبتلا ہوتے ہیں۔ ایسی عبارتیں قاری کے لیے کسی طور پر مفیدِ مطلب نہیں ہوتیں، نیز ان عبارتوں میں مترادف الفاظ کا استعمال اور بھی ذہنی خلجان کا سبب بنتا ہے، مثلاً:

"ایک اچھا معاشرہ اس طرح تربیت پاتا ہے کہ ہم لوگ باہم تحمل و بردباری، میانہ روی و اعتدال، محبت و پیار، برادری و بھائی چارہ کو اولیت دیں۔"[1]

اس جملے میں چار مرکبات ہیں، جن کے دونوں الفاظ آپس میں ہم معنی ہیں، ان میں سے ہر ایک کا ایک لفظ نکال دیا جائے تو جملے کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا اور معنویت میں بھی فرق نہیں آئے گا، بلکہ جملہ زیادہ سلیس ہوگا۔ اگر مرکبات کا استعمال ضروری ہو تو پھر دو مختلف المعنی الفاظ کے مرکب عطفی بنائیے، مثلاً:

"ایک اچھا معاشرہ اس طرح تربیت پا سکتا ہے کہ افراد باہم بردباری و ہم آہنگی، محبت و رواداری اور ہمدردی و تعاون کے حامل ہوں۔"

جملے بہت لمبے اور گنجلک الفاظ سے پاک ہوں تو عمدہ عبارت تشکیل پاتی ہے۔

[1] "محبت و پیار" اور "برادری و بھائی چارہ" کی ترکیبیں ویسے ہی غلط ہیں، کیونکہ ہندی اور عربی فارسی الفاظ سے مرکب عطفی نہیں بنتا۔ (فارانی)

الفاظ کی جمع الجمع:

بعض الفاظ کی جمع کی مزید جمع بنا لی گئی ہے جس کی ضرورت اور اہمیت کسی طور مناسب دکھائی نہیں دیتی، مثلاً:

الفاظ	معنی	جمع	جمع الجمع
وجہ	باعث	وجوہ	وجوہات
حکم	فرمان	احکام	احکامات
اکبر	بڑا شخص	اکابر	اکابرین
رکن	فرد	ارکان	اراکین
لازمہ	ضروری شے	لوازم	لوازمات

ایسے اور بھی الفاظ ہیں جو اس وقت مستحضر نہیں۔ آپ کو صرف اصول یاد رکھنا چاہیے کہ اصل جمع ہی استعمال کریں۔ جمع الجمع خواہ مخواہ رائج ہو گئی ہے، اس سے عبارت کی ثقاہت مجروح ہوتی ہے، اہلِ علم کو ان پر توجہ فرمانی چاہیے۔

دن بہ دن:

اس کا استعمال بڑی نادانی اور مکھی پر مکھی مارنے کے مترادف ہے۔ یہ اصول طے شدہ ہے کہ ہندی الفاظ کو عربی فارسی الفاظ کی طرح مرکب کرنا

درست نہیں۔ اس کو "روز بہ روز" لکھنا چاہیے۔ اگر دن کا استعمال کرنا ضروری سمجھا جائے تو "آئے دن" لکھنا چاہیے، البتہ اس کو "آئے روز" لکھنا غلط اور روزمرہ سے باہر ہوگا۔

نِت نئے روز:

"نِت" اردو/ہندی لفظ ہے جس کا معنیٰ "ہر روز" ہے، یعنی "روز یا دن" اس میں موجود ہے، اس کا استعمال اس وقت ہوتا ہے جب کوئی کام بار بار، ہر روز یا چند روز کے غیر مقررہ وقفے سے ہوتا ہو، مثلاً: "خان صاحب نت نیا لباس پہن کر نکلتے ہیں۔" "شہر کی پولیس ہمارے گاؤں میں نت نئی آفت لے کر آتی ہے۔"

ایک شاعر بھی اس قسم کے حالات سے گزرا اور پکار اٹھا ؎

قیس اور فرہاد کو اس نے دکھائے دشت و کوہ
عشق ہم کو نِت نیا اک کام فرماتا رہا

ہمارے بعض اہلِ قلم "نت نئے" کا استعمال کرتے وقت نئے کے ساتھ دن یا روز لکھتے ہیں، حالانکہ روز یا دن کا مفہوم تو "نِت" میں موجود ہوتا ہے۔ اس لیے نئے کے ساتھ وہ کام یا واقعہ لکھنا چاہیے، جیسے اوپر نیا لباس اور نئی آفت کا ذکر ہے۔ یاد رہے کہ نت کے بعد "نیا" یا "نئے" یا "نئی" آگے آنے والی بات کی صفت ہوگی۔

فصلات۔ سڑکات۔ شاہرات:

فصل کی جمع فصول ہے۔ اردو میں اس کی جمع فصلیں/فصلوں وغیرہ ہوتی ہے، مگر فصلات بالکل غلط ہے۔ یوں ہی سڑکیں اور شاہراہیں ہیں۔ ان کے

ساتھ "ات" کا اضافہ جدت نہیں ہے، بلکہ اردو زبان والی جمعیں ہی درست ہے۔ ایک ستم ظریف نے چٹھی کی جمع چٹھیات بھی لکھی ہے!!

حیرانگی۔ درستگی۔ ناراضگی۔ کرختگی:

غالباً پہلے بھی اس قسم کی "گی" کا استعمال اس کالم میں سمجھایا جا چکا ہے، تاہم اس کا غلط استعمال بدستور جاری ہے اور بعض اہلِ قلم ابھی اس سے ناآشنا ہیں۔ "گی" کا استعمال دراصل کسی فارسی اسم یا فعل کو حاصل مصدر کی صورت میں لانے کے لیے ہوتا ہے اور اس اسم یا فعل کا آخری حرف "ہ" (ہائے ہوز) ہوتا ہے جس کے آخری "ہا" کو ہٹا کر "گی" لگایا جاتا ہے، جیسے: بے چارہ سے بے چارگی، گم شدہ سے گم شدگی، وارفتہ سے وارفتگی اور آوارہ سے آوارگی وغیرہ۔

اوپر عنوان میں مذکورہ الفاظ کی "گی" ہٹا کر دیکھیے، وہاں کسی جگہ ہائے ہوز نہیں ہے۔ حیران، درست، ناراض اور کرخت کے آخری حروف سامنے ہیں، ان کے بعد "گی" کا کوئی جواز نہیں، بلکہ ان کے آخر میں یائے معروف (ی) لگا کر حاصل مصدر حیرانی، درستی، ناراضی اور کرختی (مثل سختی) بنیں گے۔

ہم معنی مرکب یا الفاظ کا ایک ساتھ استعمال:

بعض اہلِ قلم رواروی میں ہم معنی الفاظ کو ایک ساتھ استعمال کر کے سمجھتے ہیں کہ انھوں نے عبارت میں زور پیدا کر دیا ہے، مثلاً:

"کل رات تقریباً کم و بیش دس بارہ ڈاکوؤں نے فلاں بنک پر ڈاکا ڈالا۔"

"آپ بے شک معزز شخص نظر آتے ہیں، مگر آپ سے تعارف اور

جان پہچان کیے بغیر ہم آپ کی مدد کرنے سے قاصر ہوں گے۔''

ان میں سے پہلے جملے میں تقریباً اور کم و بیش ہم معنی ہیں اور دوسرے میں تعارف اور جان پہچان ایک ہی مفہوم کے حامل ہیں۔ یہ عبارت کی سلاست کے خلاف ہے۔ ان میں سے ایک ایک لفظ، یعنی پہلے میں ''تقریباً'' یا ''کم وبیش'' اور دوسرے میں ''تعارف'' یا ''جان پہچان'' کو استعمال کرنا چاہیے۔

اسی طرح ''تاہم'' اور ''پھر بھی'' میں سے ایک کا استعمال مناسب ہو گا، دونوں کا نہیں۔

سَچّا۔ سُچّا:

سُچّا (س پر پیش) دراصل کوئی لفظ نہیں۔ اصل لفظ سَچّا (س پر زبر) ہی ہے۔ بعض اہلِ قلم ''سچّا'' میں شدت پیدا کرنے یا بہ معنی خالص ظاہر کرنے کے لیے ''سچّا'' کی سین پر پیش کے ساتھ ضرور لکھتے ہیں۔ پنجابی میں یہ سُچّا کا غلط العام معروف ہو گیا ہے، لیکن اردو میں اس کا کوئی مقام نہیں۔ خالص اور بے کھوٹ کے لیے وہی سَچّا (سین پر زبر کے ساتھ) ہی درست ہے۔

جو کہ:

''آپ نے میرا قلم واپس نہیں کیا، جو کہ آپ نے کل خط لکھنے کو لیا تھا۔''

''جو'' کے بعد ''کہ'' کا استعمال غلط ہے، صرف ''جو'' کافی ہے۔

نہ تو۔ نہ ہی:

''آپ نے کل میرے ہاں آنے کا وعدہ کیا تھا، مگر نہ تو آپ خود آئے اور نہ ہی بذریعہ فون مطلع فرمایا۔''

اس جملے میں پہلے حرفِ نفی (نہ) کے بعد ''تو'' اور دوسرے کے بعد ''ہی'' غیر ضروری (حشو یا زائد) ہیں۔ ''نہ'' کے بعد کسی جملے میں ان کی ضرورت نہیں ہوتی۔

قابلِ شرم:

''آپ کا بھری محفل میں قول سے مکر جانا قابلِ شرم فعل تھا۔''

''قابلِ شرم'' غلط ہے، اصل مرکب ''شرمناک'' ہے۔

من پسند:

بعض قلم کار ''دل پسند'' کی طرح ''من پسند'' کی ترکیب بھی استعمال کرتے ہیں۔ ''من'' ہندی لفظ ہے، جس کا معنی دل ہے جب کہ ''پسند'' فارسی لفظ ہے، اس لیے ''من'' (ہندی) لفظ کے ساتھ اس کا مرکب بنانا اصولاً غلط ہے جو کسی لغت میں نہیں ملے گا۔ اس کے لیے دل پسند، پسندیدہ اور دل پذیر جیسے الفاظ استعمال ہو سکتے ہیں۔

عبارت کی صحت:

لغات کی ایک کتاب سے اقتباس:

"کیکاؤس: مشہور بادشاہ رستم جس کی فوجوں کا جرنیل تھا۔"

لغات نویس نے اس جملے میں یہ مفہوم بیان کیا ہے کہ کیکاؤس ایک بادشاہ تھا اور رستم نامی ایک شخص اس کی فوجوں کا جرنیل تھا، لیکن مطلوبہ مفہوم جملے کی موجودہ ساخت میں پہلی نظر ہی میں سمجھ میں نہیں آتا، بلکہ پہلے تین لفظ بتاتے ہیں: "مشہور بادشاہ رستم" تھا۔ بادشاہ کے ساتھ رستم کا نام جملے کی معنویت کو متاثر کرتا ہے۔ لغات میں مطلوبہ لفظ کا معنی اور تشریح بیان کرنے پر توجہ دینی چاہیے۔ اس کے متعلقات کو الگ جملوں میں لانا چاہیے۔ مثلاً: اسی لفظ کیکاؤس کے معنی یوں بیان کرنے چاہئیں تھے:

"کیکاؤس ایران کا بادشاہ تھا۔ فردوسی کے شاہنامے کا مشہور ہیرو رستم اسی کے لشکر کا جرنیل تھا۔"

غیاث اللغات (فارسی کا مشہور لغت) میں اسی سے ملتے جلتے الفاظ ہیں:

"پادشاہے از ایران کہ رستم از رفیقانِ او بود۔"

ہم معنی الفاظ کا ایک ساتھ استعمال:

① تقریباً... کے قریب:

"کل ایک ریل گاڑی دیکھی، جو بہت لمبی تھی، اس کے ڈبے تقریباً پندرہ کے قریب تھے۔"

② لگاتار... مسلسل:

"پچھلے ہفتے لگاتار برسات مسلسل پانچ دن ہوتی رہی۔"

③ تاہم... پھر بھی:

"میں نے اسلم بھائی کو سمجھایا کہ تھانیدار کے خلاف کوئی بات نہ کرے، تاہم اس نے پھر بھی لوگوں کو بتا دیا کہ وہ رشوت خور ہے۔"

مندرجہ بالا جملوں میں جو دو دو ہم معنی الفاظ استعمال ہوئے ہیں، ان میں سے ایک لفظ استعمال کرنا چاہیے۔ زبان کی صحت کا یہی تقاضا ہے کہ موزوں الفاظ اپنے اپنے مقام پر نگینے کی طرح جڑے ہوں۔

ناعاقبت اندیش...:

لاہور میں محترم طالب ہاشمی صاحب صحتِ زبان کے لیے خاصی خدمات انجام دیتے رہے۔ جہاں کہیں کسی لفظ، ترکیب یا اصطلاح میں اشکال محسوس ہوتا، ان سے رائے لی جاتی اور وہ نہایت فراخ دلی سے راہنمائی فرماتے۔

ہاشمی صاحب سے چند الفاظ: ناعاقبت اندیش، ناحق شناس، ناخدا ترس وغیرہ تراکیب کے سلسلے میں گزارش کی گئی کہ ہم اپنے مضامین میں ان تراکیب کو یوں استعمال کرنے کا مشورہ دیتے ہیں کہ... ناعاقبت اندیش کے بجائے عاقبت نااندیش... ناحق شناس کے بجائے حق ناشناس اور ناخدا ترس کے بجائے خدا

ناترس ...لکھنا چاہیے۔ انھوں نے اس اصلاح کو درست قرار دیا۔

جب ان سے پوچھا: فرہنگِ آصفیہ، نور اللغات، قائد اللغات اور فیروز اللغات (جو ہمارے ہاں متداول اور معتبر ہیں) ہمارے خیال کے برعکس سب کے سب لفظِ نفی یعنی ''نا'' کو پہلے لائے ہیں۔ اس کا کیا علاج؟ اس پر ہاشمی صاحب نے فرمایا: ان مرتبین نے یہ الفاظ غلط العام کے طور پر تسلیم شدہ جان کر درج کیے ہیں۔

اب سوچنے کی بات ہے کہ غلط العام قرار دینے والا مجاز ادارہ کون سا ہے؟ نیز ان تراکیب کی معنویت کیا ہے جس سے یہ درست ثابت ہوتے ہیں؟ قارئین کرام! ملاحظہ فرمائیں:

① ناعاقبت اندیش: ایسی چیز کا اندیشہ یا خوف یا خیال رکھنے والے لوگ جو عاقبت نہ ہو... اس میں عاقبت کی نفی ہے، اندیشے کی نہیں۔ اس کی مثبت ترکیب ''عاقبت اندیش'' ہے، یعنی یومِ عاقبت (قیامت) سے ڈرنے والا۔ اور اس کا منفی لامحالہ یہی ہونا چاہیے: ''عاقبت نااندیش۔'' یعنی مسئلہ اندیشہ کرنے یا نہ کرنے کا ہے۔

② ناحق شناس ...ایسی چیز کو جاننے والے جو حق نہ ہو۔ اس کا مثبت حق شناس ہے۔ تو یہاں بھی مسئلہ ناحق کا نہیں، شناس اور ناشناس کا ہے۔ لغات والا اس کا معنی لکھ رہا ہے: ''خدا کو نہ پہچاننے والا۔'' جب کہ ترکیب بتا رہی ہے کہ وہ ناحق کو پہچاننے والا ہے۔

③ ناخدا ترس: یہ تو ترکیب ہی نہایت مضحکہ خیز ہے۔ اہلِ لغت کہہ رہے ہیں

کہ اس کا معنی ہے: ''خدا سے نہ ڈرنے والا'' جب کہ دوسری جگہ ناخدا کا معنی لکھا ہے: ملاح، جہاز ران۔ گویا ملاح یا جہاز سے ڈرنے والا صحیح معنی ہوگا۔ خدا سے نہ ڈرنے والا نہیں۔

اہلحدیث:

یہ املا غلط ہے، اصل میں یہ مرکب ہے اہل اور حدیث کا ... جو قواعد کی زبان سے اسم فاعل ہے۔ اس کو اکٹھا لکھنے میں اس کی معنویت میں شاید زیادہ فرق سمجھ میں نہ آتا ہو، حالانکہ فرق موجود ہے۔ اگر یہ غلط العام ہوتا تو کہا جا سکتا تھا کہ چلیے اب عام ہو گیا ہے، قبول کرنا چاہیے، مگر یہ تو غلط العوام ہے اور اہلِ علم اسے غلط ہی کہتے ہیں۔ اس کی املا درست کرنی چاہیے اور ''اہلِ حدیث'' (بالاضافۃ) لکھنا چاہیے۔

اہلحدیثوں۔ اہلِ حدیثوں:

بعض مضامین میں اس قسم کے جملے ملتے ہیں: ''میں اہلِ حدیثوں/ اہلحدیثوں کو یہ پیغام دینا چاہتا ہوں ....'' یہ قطعاً علمی ترکیب نہیں ہے۔ اہلِ حدیث کی جمع اردو میں اہلِ حدیث ہی ہے۔ ''اہل'' کا لفظ ایک شخص ہو یا زیادہ، ہر جگہ مستعمل ہے، مثلاً: فلاں اجلاس میں اہلِ حدیث نے بھی اپنا موقف پیش کیا۔

اہلِ سنتوں، اہلِ تقلیدوں، اہلِ علموں، اہلِ نظروں، اہلِ دلوں، اہلِ لاہوروں، اہلِ پشاوروں اور اہلِ دہلیوں وغیرہ تمام ترکیبیں غلط، بلکہ مضحکہ خیز ہیں۔ یہی صورت اہلحدیثوں کی ہے، لہٰذا جمع کی صورت میں بھی اہلِ حدیث لکھنا ہی درست ہے۔

شجروں۔ حجروں وغیرہ:

عربی فارسی الفاظ کی جمع اردو کے طریقے سے بنانا بڑی نادانی کی بات ہے، کیوں کہ ان الفاظ کی جمع پہلے سے طے شدہ ہے اور اردو میں استعمال بھی اسی کا ہونا چاہیے، مثلاً: شجر، حجر ... عربی الفاظ میں ان کی جمع شجروں، حجروں قطعاً غلط ہے۔ ان کا استعمال یا تو اردو مترادفات یعنی درختوں، پتھروں سے کرنا چاہیے یا ان کی حقیقی جمع اشجار، احجار وغیرہ سے لکھی جائے۔

اولاد کے لیے لختِ جگروں، نورِ چشموں کہنا یا لکھنا بھی مندرجہ بالا قبیل ہی سے ہے جو یقیناً مضحکہ خیز ہے، اس کا اصل استعمال یہ ہے: فلاں فلاں میرے لختِ جگر یا نورِ چشم ہیں۔[1]

مترادفات کے مرکباتِ عطف:

عقل و سمجھ، سوچ و بچار، غم و الم، شادی و خوشی، بہادری و دلیری۔ یعنی ہم معنی الفاظ کو ترکیبِ عطف میں نہیں لانا چاہیے۔ مرکبِ عطفی قریب المعنی یا مختلف المعانی الفاظ پر مشتمل ہونا چاہیے، مثلاً: فکر و عمل، درد و الم، ذوق و شوق، قلب و نظر وغیرہ۔
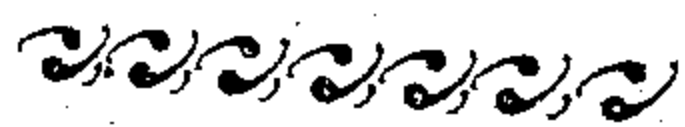
[1] ''نورِ چشم'' کو ''نورِ چشمی'' لکھنا بھی یکسر غلط ہے۔ (فارانی)

بعض جملے یا جملہ نما ترکیبیں:

''یہ کتنی ورطۂ حیرت میں ڈالنے والی بات ہے۔'' یہ پر تکلف جملہ صاحبِ تحریر کی وسعتِ علم کا مظہر ہے، مگر عبارت کی سلاست پر جبر کا نشان ہے۔ سادہ جملہ فقط یہ تھا: ''یہ بات کتنی حیران کن ہے'' ... یا... ''یہ حیرت انگیز بات ہے۔''

ترکیبیں:

① فی زمانہ: یہ آج کل یا ان دنوں یا دورِ حاضر میں، کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے، مگر اس کو ''فی زمانہ'' نہیں ''فی زمانِنا'' یعنی ہمارے اس عہد میں ...لکھنا چاہیے۔

② یادگیری لمحات: یادگار لمحات کو یادگیری لمحات کہنا یا لکھنا اپنی بے علمی کا اظہار کرنا ہے۔

③ مرکبِ عطف: مرکبِ عطف کے دونوں اسماء ایک ہی زبان کے ہونے چاہئیں، مثلاً: آفاتِ زمینی و سماوی غلط ہے۔ زمینی و آسمانی یا ارضی و سماوی لکھنا چاہیے۔

چلتے ہوئے جملے:

① سمجھ آئی؟ سمجھ نہیں آئی؟

یہ پنجابی انداز ہے۔ اردو میں یہ جملہ اس طرح بولا یا لکھا جاتا ہے: ''کیا یہ بات آپ کی سمجھ میں آ گئی؟'' یا ''کیا یہ بات آپ کی سمجھ میں نہیں آئی؟'' کہتے ہیں کہ پنجاب سے ایک پروفیسر علی گڑھ یونیورسٹی میں لیکچرار متعین ہو گئے، وہ لیکچر ختم کر کے طلبا سے پوچھا کرتے: ''سمجھ آئی؟'' تو طلبا اس پر ہنس دیتے، مگر یہ بات خود ''ان کی سمجھ میں نہیں آئی'' کہ لڑکے کیوں ہنس رہے ہیں۔

② حسد کی آگ میں جلنا شروع ہو گیا۔

یہ ''شروع ہو گیا'' بھی پنجابی انداز ہے اور اردو عبارت نویسی کے خلاف ہے۔ یہاں صرف ''جلنے لگا'' کافی ہے۔ اسی طرح ''شروع ہو گیا'' دوسرے مقامات پر بھی غلط ہو گا، وہاں فعل کا مصدر لکھ کر ساتھ ''لگا'' لکھنا چاہیے ... ہنسنے لگا، رونے لگا اور بکنے لگا وغیرہ۔

حیرانگی۔ درستگی:

حیرانی کے بجائے حیرانگی اور درستی کے بجائے درستگی اتنا عام ہو گیا ہے کہ اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگ بھی حیرانگی اور درستگی لکھتے اور بولتے ہیں۔ ''گی'' حاصل مصدر کی علامت ہے، مثلاً: کردہ سے کردگی، بستہ سے بستگی، خواندہ سے خواندگی ... یہ فعل کی مجہول حالت سے حاصل مصدر بنتا ہے اور فعل مجہول کی نشانی فعل کے آخر میں ہائے مختفی کا ہونا ہے ... یعنی بستہ اور شکستہ وغیرہ ... حیران اور درست دونوں افعال نہیں، بلکہ اسمائے صفت ہیں، ان کی مجہول حالت کیسے ہو گی کہ اس کے پیچھے ''گی'' کی دُم باندھ دی جائے؟!

ہمزہ اور یائے مجہول:

بعض الفاظ میں ہمزہ اور یائے مجہول کی ملی جلی آواز پیدا ہوتی ہے، مثلاً: لیجیے، دیجیے، کیجیے، وغیرہ۔ اکثر دوست ان کی املا یوں لکھتے ہیں: لیجئے، دیجئے، کیجئے۔

غور کیا جائے تو پتا چلتا ہے کہ آخری یائے مجہول پر ہمزہ نہیں، بلکہ ''یا'' بول رہی ہے، اس لیے ہمزہ کے بجائے اس کے نیچے دو نقطے ڈالنے چاہئیں۔ ہمزہ آئے، گئے، جائے وغیرہ میں بول رہا ہے، لہٰذا ان میں اس کا استعمال درست ہے۔
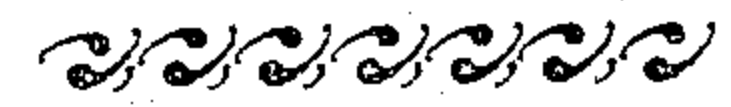
پہ (بجائے پر):

''پہ'' حرفِ جار ہے، جو ''پر'' کا مخفف ہے اور نظم میں وزن کی تخفیف کے لیے ''پر'' کی جگہ استعمال ہوتا ہے ؂

لب وہ کہ لعل کے بھی نگینے پہ حرف ہے

(انشا)

خنجر پہ کوئی داغ نہ دامن پہ کوئی چھینٹ
تم قتل کرو ہو کہ کرامات کرو ہو!

نہ تھا پیکاں پہ کیا جوہر جو نامہ تیر پر لکھا
اشارہ قتل کا قاتل نے کس تقصیر پر لکھا

ان مصرعوں میں ''پہ'' کی جگہ اگر ''پر'' لگا دیں تو وزن تلپٹ ہو جائے گا۔

اس لیے نثر نگار حضرات کو یاد رہنا چاہیے کہ لفظ ''پہ'' کوئی ادبی محاسن کا باعث نہیں ہوتا کہ آپ اسے نثر میں بھی لکھتے رہیں، بلکہ نثر کی خوبی الفاظ کی تخفیف میں نہیں، ان کے پورے تلفظ کو واضح کرنے میں ہے، لہٰذا ان حضرات سے گزارش ہے کہ وہ ''پہ'' کو نثر میں خواہ مخواہ استعمال نہ کریں، بلکہ سرے سے استعمال ہی نہ کریں، کیوں کہ یہ نثر کا نہیں نظم کا مخصوص لفظ بلکہ ''نصف حرفِ جار'' ہے۔

شاعر حضرات بھی نوٹ فرما لیں کہ وہ بھی ''پر'' کے مقام پر ''پہ'' لگائیں

گے تو وہ ''پے'' پڑھا جائے گا۔ جیسے اوپر کے تیسرے شعر کی ردیف کا پہلا لفظ ''پر'' ہے۔ اگر وہاں ''پہ'' لکھا جائے تو وہ ''تیر پے لکھا''، ''تقصیر پے لکھا'' پڑھا جائے گا، جو صریحاً غلط ہوگا۔

شانِ نزول:

قرآن مجید کا ترجمہ کرنے والے بعض حضرات ''آیات کی شانِ نزول'' کی جگہ ''آیات کا شانِ نزول'' لکھتے ہیں۔ وہ نزول (مذکر) کو ملحوظ رکھتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں کہ نزول ترکیبِ اضافی کا جزو ہے۔ شان مضاف اور نزول مضاف الیہ ہے۔ اردو میں حرفِ اضافت (کا، کے، کی) اس کی تذکیر و تانیث کی نشان دہی کرتا ہے۔ مضاف شان ہے، جس کی تذکیر و تانیث مطلوب ہے، مزید وضاحت کے لیے اس کا اردو ترجمہ دیکھیں: ''آیات کے نازل ہونے کی شان'' ہوگی، ''کا شان'' نہیں ہوگا۔

یہی صورت (غالباً بے خیالی میں) نمازِ جنازہ کے ساتھ پیش آتی ہے، مسجدوں میں اعلان ہوتا ہے کہ ''فلاں صاحب گذشتہ رات قضائے الٰہی سے وفات پا گئے ہیں اور ان کا نمازِ جنازہ آج نمازِ ظہر کے بعد پڑھا جائے گا۔'' ایک تو یہ کہ وفات قضائے الٰہی ہی سے ہوتی ہے، اس کے اعلان کی ضرورت نہیں ہوتی۔ نمازِ جنازہ میں نماز پڑھنا مقصود ہوتا ہے، جنازہ پڑھنا نہیں، لہٰذا ''نمازِ جنازہ پڑھی جائے گی'' کہنا چاہیے، یعنی جنازے کی نماز پڑھی جائے گی۔

اِقدام اٹھانا:

اکثر لوگ اس قسم کے جملے بولتے یا لکھتے ہیں: ''فلاں صاحب نے محلے

کی صفائی کے لیے بڑا دلیرانہ اقدام اٹھایا ہے۔ اب ہر صبح گلیاں صاف ہوا کریں گی۔'' اقدام مصدر ہے، جس میں اٹھانا معنوی طور پر موجود ہے، لہٰذا اردو عبارت آرائی میں عربی مصادر کے ساتھ کرنا، ہونا وغیرہ لگایا جا سکتا ہے، لہٰذا ''اقدام کیا ہے'' کہنا چاہیے۔ البتہ ''قدم اٹھانا'' درست ہوگا۔

انتہائی:

اکثر دوست بات کرتے یا لکھتے وقت بے سوچے سمجھے کہہ یا لکھ دیتے ہیں کہ فلاں شخص انتہائی تعلیم یافتہ ہے، فلاں انتہائی کامیاب ڈاکٹر ہے، ہم نے انتہائی کوشش کر دیکھی، مگر کام پورا نہ ہو سکا، وغیرہ۔

لفظ ''انتہا'' پر غور کیا جائے تو آدمی اس کی کوئی حد مقرر نہیں کر سکتا۔ اصل میں ہم لوگ اپنی قوت، صلاحیت، وسائل و دلائل کے آخری کنارے کو انتہائی کہہ دیتے ہیں۔ علامہ اقبال نے کہا تھا:

خرد مندوں سے کیا پوچھوں کہ میری ابتدا کیا ہے
کہ میں اس فکر میں رہتا ہوں میری انتہا کیا ہے
(بالِ جبریل)

گویا انتہا کی فکر فرما رہے ہیں جس کا سرا بھی ہاتھ نہیں آتا۔ انتہا کا مترادف ''نہایت'' بھی ہے، جو بڑی بے تکلفی سے استعمال ہوتا ہے۔ ہمارے دوست اسحاق بھٹی صاحب اس کو بڑی ''تجوید'' کے ساتھ ''نہیت'' (یائے مجہول کو دور تک کھینچتے ہوئے) ادا کرتے ہیں، جو ''مَجْرِھَا'' کی یائے مجہول سے بھی زیادہ طوالت لیے ہوتا ہے، یعنی فلاں شخص نہایت اچھا مضمون نگار ہے۔

ایسی صورت میں بہت اچھا، بہت عمدہ یا بہت ہی عمدہ لکھا جا سکتا ہے، کوشش کے لیے: ہم نے اپنی پوری پوری کوشش کر دیکھی، مگر کام نہ ہو سکا۔ فلاں شخص بہت ہی تعلیم یافتہ ہے۔ فلاں ماہر ترین ڈاکٹر ہے۔ ہم نے اپنی تمام تر قوت صرف کر دی تب جا کر یہ مرحلہ طے ہوا۔ وغیرہ

ہائے مخلوط:

(یہ قندِ مکرر نہیں سمع خراشی مکرر ہے)

دو چشمی ہا (ھ) کو ہائے مخلوط کہتے ہیں، کیوں کہ یہ بعض ہندی حروف کی آواز بھاری کرنے کے لیے ان کے ساتھ ملا دی جاتی ہے اور وہ ایسے حرف بنتے ہیں کہ آواز میں بھاری پن کا اظہار ہوتا ہے۔ وہ حروف یہ ہیں:

ب سے "بھ"، پ سے "پھ"، ت سے "تھ"، ٹ سے "ٹھ"، ج سے "جھ"، چ سے "چھ"، د سے "دھ"، ڈ سے "ڈھ"، ڑ سے "ڑھ"، ک سے "کھ"، گ سے "گھ"، ل سے "لھ"، م سے "مھ"، ن سے "نھ"۔

ان کے استعمال کا ایک ایک نمونہ: بھائی، پھول، تھان، ٹھوکر، جھوٹ، چھتری، دھوبی، ڈھال، باڑھ، کھیت، گھوڑا، چولھا، تمھارا، انھیں ہے۔

دینی مدارس کے علماء وطلباء عربی زبان کی مثال کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہائے مخلوط (ھ) کو ایسے الفاظ میں بھی استعمال کرتے ہیں جہاں ہائے ہوز ہی کا مقام ہوتا ہے۔ یاد رہے کہ ہائے ہوز الفاظ میں کسی مقام پر ہو، اس کی آواز الگ سنائی دیتی ہے۔ لفظ کے شروع میں: ہم، ہاتھی، ہولی، وغیرہ۔

لفظ کے درمیان میں ...مہم، مہربان، مہک، وغیرہ۔

لفظ کے آخر میں: شاہ، آگاہ، کوئٹہ، ہالہ وغیرہ۔

آخر میں آنے والی "ہ" کو ہائے مختفی بھی کہا جاتا ہے، جیسے اوپر کوئٹہ اور ہالہ میں ہے۔ ہائے مخلوط کی آواز الگ نہیں ہوتی، کیوں کہ اس کی حیثیت آزاد حرف کی نہیں، بلکہ یہ ایک حرف میں مدغم ہو کر ایک مختلف آواز کا حصہ بنتی ہے۔ اس کا استعمال خاصے احتیاطی رویے کا متقاضی ہے۔

ہائے مخلوط اردو میں بیان کردہ طریقے کے علاوہ اگر ایسے لفظوں میں استعمال ہو گی جہاں ہائے ہوز بالاعلان بول رہی ہے تو بعض جگہ نہایت مضحکہ خیز صورت پیدا کر دے گی... مثلاً: ایک ہاکی کا کھلاڑی لکھتا ہے: "میں کل پہلو بدل بدل کر کھیلتا رہا۔" اب ذرا پہلو کو ہائے مخلوط سے لکھیے ...؟ اسی طرح اردو کے اور بھی الفاظ ہیں جن میں ہائے مخلوط کسی نامناسب لفظ کی صورت پیدا کر دے گی۔

جوتا ڈالو۔ کپڑے ڈالو۔ کہتے ہوتے ہیں۔ یوں نہیں کرتے ہوتے:

ہمارے ہاں بچوں کے ساتھ اردو بولنے کا رواج کوئی نصف صدی پہلے، یعنی پاکستان کے قیام کے جلد ہی بعد شروع ہوا تھا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ اردو ہماری قومی زبان ہے، اس لیے اس کو نرسری سے شروع کریں گے تو پوری قوم "اردو سپیکنگ" ہو جائے گی۔ ان بزرجمہروں کی سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ ہمارے ہاں جتنے صوبے ہیں وہ سب کے سب تقریباً لسانی بنیادوں پر ہیں اور ہر صوبے میں ایک مادری زبان بولی جاتی ہے۔ اردو کے لیے یہ اچھی بات تھی کہ وہ قومی زبان کے طور پر یہاں نافذ ہوتی اور اس کو دفاتر میں بھی نافذ کیا جاتا۔ بچوں کو بدستور اپنی مادری زبان بولنے دی جاتی۔

اب اس کا نتیجہ کیا ہے؟ کسی صوبے میں اردو زبان قوم کی رگ و پے میں

سرایت نہیں کر سکی۔ نصف صدی بھی اس کا کوئی نمونہ پیش نہیں کر سکی۔ ہمارے ہاں جو بڑے ہیں وہ بچوں کے ساتھ اردو بولنا ایک فریضہ سمجھتے ہیں، مگر بولتے اپنے ہی لہجے میں ہیں۔ پنجابی میں "جتی پاؤ، کپڑے پاؤ" عام بول چال ہے، مگر اردو بولنے والوں نے "پاؤ" کا اردو ترجمہ "ڈالو" سمجھ کر "جوتا ڈالو، کپڑے ڈالو" ہی اپنایا ہوا ہے۔

اسی طرح پنجابی میں ہم کہتے ہیں: "اسیں ایس طرح نہیں کہندے ہندے۔" یعنی ایک جملے میں دو دو فعل ہماری مادری زبان میں سرزد ہوتے ہیں۔ اردو میں "کردے یا کہندے" کو کرتے یا کہتے تو درست ترجمہ ہے، مگر ساتھ "ہندے" اس فعل کے استمرار کے لیے ہوتا ہے۔ اس کا ترجمہ "ہوتے" بھی درست ہے، مگر اردو میں دو فعل اس طرح استعمال نہیں ہوتے، لہٰذا "کرتے ہوتے اور کہتے ہوتے" اردو کا بھونڈا انداز ہے۔ وہاں متذکرہ استمرار کے لیے یوں کہتے ہیں: "ایسا نہیں کہا کرتے" ... یا ... "ایسا نہیں کیا کرتے۔" یہ اردو زبان کی درست عبارت ہے۔

بار ہا مرتبہ:

بارہا مرتبہ سے ہمارے بعض اہلِ قلم "کئی بار" یا "کئی مرتبہ" مراد لیتے ہیں، حالانکہ صرف بارہا لکھنے سے مراد کئی بار ہوتا ہے۔ یہ فارسی ترکیب ہے جو اردو میں بھی اسی طرح اور انھی معنوں میں مستعمل ہے۔ اس کے ساتھ "مرتبہ" لکھنا ایسا ہی ہے جیسے کہا جائے: "پچاس سالہ برس کا آدمی" یا "پچاس سالہ عمر کا شخص" حالانکہ اس کے لیے صرف "پچاس سالہ شخص" کافی ہے، اسی طرح بارہا

کے ساتھ مرتبہ لکھنے کی ضرورت نہیں۔

بارہا از کوئے تو محرومِ دیدار آمدم

جواں سال۔ کہن سال۔ پانچ سالہ:

ایک جگہ پڑھنے میں آیا کہ ”فلاں کا جواں سالہ بیٹا فلاں انتقال کر گیا۔“ یاد رہے کہ عمر کے سلسلے میں جب آپ گنتی بولتے یا لکھتے ہیں تو اس کے ساتھ سال کو ”سالہ“ کہیں اور لکھیں گے، مثلاً: پانچ سالہ، دس سالہ وغیرہ۔ لیکن جب آپ کو گنتی معلوم نہیں، صرف عمر کا ایک حصہ معلوم ہے تو اس کے لیے صرف سال لکھا جاتا ہے، یعنی جواں سال، کہن سال، خرد سال وغیرہ۔[1]

[1] تاہم یہ پانچ سالہ، دس سالہ وغیرہ ترکیبیں ذم کا پہلو رکھتی ہیں، لہٰذا بہتر ہے ان کے بجائے ”پانچ سال کا“ یا ”پانچ برس کا“ لکھیے، تاکہ قاری کا ذہن برادرِ نسبتی میں نہ جا اُلجھے۔ (فارانی)

عوام:

عوام کے لفظی معنی ”عام لوگ“ کے ہیں، جو کسی ملک میں آباد ہیں اور اس کے شہری ہیں۔ ہمارے سیاست دان اپنی تقریروں میں اس کو مؤنث بولتے ہیں، جیسے: ”ہماری عوام بہت معاملہ فہم اور مردم شناس ہے“۔[1]

یہ لفظ مؤنث نہیں بلکہ مذکر ہے اور جمع بولا جاتا ہے، جیسے: ہمارے عوام بہت معاملہ فہم اور مردم شناس ہیں۔“ اس کو مؤنث بولنے سے پرہیز کرنا چاہیے۔ اس سلسلے میں پہلے لفظ ”رعایا“ مستعمل تھا جو بادشاہوں کے زمانے سے چلا آرہا تھا۔ اب جمہوری معاشرے نے ”عوام“ کا لفظ رائج کیا ہے، لیکن یہ رعایا کی طرح مؤنث نہیں ہے۔

مبادا:

یہ فارسی لفظ قدیم سے اردو میں مستعمل ہے۔ ہمارے دور میں فارسی تو ملک بدر ہوگئی، اردو بھی عوام کی بے توجہی سے علیل وسقیم ہے۔ دینی حلقے عربی سے متاثر ہیں اور اردو املا میں مضحکہ خیز عبارتیں تحریر کرتے ہیں۔ دوسری طرف

[1] جہاں تک ہمیں یاد پڑتا ہے محترمہ بے نظیر بھٹو نے ”عوام“ کو ”پبلک“ کے مترادف کے طور پر مؤنث بولنا شروع کیا تو ٹی وی والوں نے اسے اس قدر دہرایا کہ خود عوام بھی اپنے آپ کو مؤنث سمجھنے لگے۔ (فارانی)

عصری تعلیمات کے بابو لوگ انگریزی کے رعب و جلال کے تحت اردو کی بے حرمتی پر ادھار کھائے بیٹھے ہیں۔

مبادا کے لفظی معنی ہیں: ''ایسا نہ ہو کہ'' .... ہمارے ہاں اس کا استعمال یوں ہوتا تھا: ''میں نے بچوں کو منزل کا نقشہ اس خیال سے سمجھا دیا، مبادا وہ رستہ بھول جائیں۔'' مبادا کے بعد ''وہ رستہ نہ بھول جائیں'' غلط ہوگا۔ ''نہ'' کے معنی مبادا کی ''م'' میں موجود ہے، اگر ''نہ'' کا استعمال ضروری ہو تو مبادا نہیں لکھا جائے گا، بلکہ جملہ یوں ہوگا:

''.... نقشہ سمجھا دیا تا کہ وہ رستہ نہ بھول جائیں۔''

دھل۔ دہل:

دوچشمی ''ہا'' یا ہائے مخلوط (ھ) ہندی الفاظ کا جز ہے جو اردو میں مستعمل ہیں، ورنہ ''ھ'' (دوچشمی) کا اردو فارسی الفاظ سے کوئی واسطہ نہیں۔ ناواقف لوگ اس کا سوچے سمجھے بغیر استعمال کر کے معنویت کو بگاڑ دیتے ہیں یا مضحکہ خیز بنا دیتے ہیں۔

اردو ہندی میں بھی اس ''ہا'' کا استعمال مطلوبہ لفظ کے تلفظ پر منحصر ہے۔ جب آپ ایسا لفظ بولتے ہیں جس میں ہائے مخلوط بول رہی ہے تو وہاں دوچشمی ''ھ'' کا استعمال ہوگا، مثلاً: کھرا، کھوٹا۔ لیکن جب اس کی آواز الگ آ رہی ہے، مثلاً: اکہرا، دہرا۔ تو ہائے ملفوظ ہوگی۔ اگر آپ دہرا کو ''دھرا'' لکھ دیں گے تو وہ کسی مشین کا پرزہ (axle) ہوگا، اسی طرح ''زیور کھوٹے سونے کا ہے'' کہیں گے تو ہائے مخلوط (ھ) ہوگی۔ اگر اس کو ''کہوٹے'' لکھیں گے تو اس کی نسبت کہوٹہ

ضلع راولپنڈی سے ہوگی اور اس کا تلفظ بولنے میں الگ ''ہ'' کا متقاضی ہوگا۔

اوپر دو لفظ دھل اور دہل دیے گئے ہیں، ''دُھل'' کے معنی ہیں: دھویا ہوا اور ''دُہل'' کے معنی ڈھول ہیں۔ اگر ''دہل گیا'' یعنی ڈر گیا کہنا ہے تو ہائے ملفوظ الگ بولے گی، جیسے: دہلی، بہلی، پہلے، چہرہ وغیرہ میں ہا بول رہی ہے۔ اگر اس جگہ ''ھ'' دوچشمی لکھ دیں گے تو معنی بدل جائیں گے، یعنی ''دہلی شہر'' کی جگہ دُھلی ماش کی دال ہوگی۔ ''بہلی گاڑی'' کے بجائے بھلی (شریف عورت) ہوگی۔ ''پہلے'' کو ''پھلے'' لکھیں گے تو پھل سے تعلق جڑے گا۔ ''چہرہ'' کو ''چُھرا'' پڑھا جائے گا۔

کئی مہینوں یا برسوں:

انگریزی، عربی اور دیگر بعض زبانوں میں کسی اسم سے پہلے اس کی تعداد کا لفظ یا ہندسہ آئے تو وہ اسم بھی جمع استعمال ہوتا ہے، جیسے انگریزی میں Two Years، عربی میں عامین (دو سال) وغیرہ، جب کہ اردو میں عدد یا عددی لفظ کے بعد اسم واحد ہی رہتا ہے، مثلاً: دس برس، تین دن وغیرہ۔ انھیں دس برسوں، تین دنوں وغیرہ لکھنا غیر ضروری ہے، البتہ گھنٹے کے سلسلے میں ایک گھنٹے کے بعد دو گھنٹے، تین گھنٹے (جمع) استعمال ہوتا ہے۔ ایسے ہی ''ایک مہینے میں''، ''تین مہینے میں'' لکھتے بولتے ہیں۔

چیدہ۔ چنیدہ:

بعض احباب کسی چیز کے انتخاب کرنے یا چننے کو فارسی انداز میں ''چنیدہ'' بولتے اور لکھتے ہیں، مثلاً: ''جب کہیں اجتماعی مفاد کے لیے وفد بھیجا جائے تو اس میں چنیدہ لوگ شامل ہونے چاہئیں۔'' چنیدہ فارسی مصادر میں کوئی لفظ نہیں۔ اصل لفظ چیدہ ہے جس کو اردو میں ترجمہ کر کے چننا کہتے ہیں۔ متذکرہ صورت میں چنیدہ کے بجائے ''چیدہ لوگ'' بولنا یا لکھنا چاہیے۔ اسی سے ''چیدہ چیدہ'' کی ترکیب ہے۔

دودھ دوہنا:

دوہنا کے معنی ہیں بھینس، گائے وغیرہ کے تھنوں سے دودھ نکالنا۔ بعض لوگ دوہنا کی املا ''دھونا'' کرتے ہیں جو بالکل غلط ہے۔ ''دھونا'' کے معنی پانی سے دھو کر برتن یا کپڑا صاف کرنا ہے، دودھ نکالنا نہیں۔

جل تھل ہونا:

موسم برسات میں یا ایک آدھ بارش ہونے پر کسی علاقے میں بہت سا پانی جمع ہو جائے تو لوگ کہتے ہیں: ''آج تو جل تھل ہو گیا۔'' جل تھل کا معنی یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ پانی اتنا جمع ہو گیا جس سے گلی کوچے، میدان اور اونچی نیچی جگہیں برابر ہو گئیں۔

معلوم ہونا چاہیے کہ جل کے معنی ''پانی'' ہے اور تھل کے معنی ''خشک زمین'' یا ''صحرا'' ہے، جیسے پنجاب کا ''تھل''۔ اس لیے جب جل تھل کے الفاظ اکٹھے استعمال ہوں گے تو کہا جائے گا... ''جل تھل ایک ہو گئے''، یعنی خشکی اور تری برابر ہو گئیں، ساری زمین پر پانی کھڑا ہو گیا۔

جب ایسی صورت ہو تو بولنا یا لکھنا چاہیے: ''آج اتنی بارش ہوئی کہ جل تھل ایک ہو گئے۔''

مجھ سے۔ میرے سے:

کسی غلطی پر بعض لوگ کہتے، بلکہ لکھتے ہیں: ''میرے سے یہ غلطی ہو گئی۔'' حالانکہ وہاں ''میرے سے'' کے بجائے ''مجھ سے'' کہنا اور لکھنا چاہیے۔

قمیص ڈالنا۔ جوتا ڈالنا:

ہمارے پنجابی حضرات بعض پنجابی جملوں کو اردو کا جامہ پہناتے ہوئے لفظی ترجمہ کرتے ہیں، جیسے: ''بچو! سکول کا وقت ہو گیا ہے، جلدی جلدی قمیص، پاجامہ ڈالو اور پاؤں میں جوتا ڈال کر تیار ہو جاؤ۔'' یہ پنجابی کے لفظ ''پاؤ'' کا اردو ترجمہ ہے، جب کہ اردو میں اس کا صحیح ''پہنو'' ہے۔ ''قمیص، پاجامہ پہنو۔ جوتا پہنو'' وغیرہ

الوداع کہنا/کرنا:

کسی عزیز کو سفر کے وقت رخصت کر کے بعض احباب بے خیالی میں کہہ دیتے ہیں: ''ہم نے بھائی جان کو حج کے لیے الوداع کیا۔'' جب آپ الوداع کہتے ہیں تو اس کے ساتھ لفظ ''کہا'' آئے گا اور جب صرف وداع کہیں گے تو اس کے ساتھ ''کیا'' آئے گا، یعنی: وداع کیا، رخصت کیا، الوداع کہا۔ یوں سمجھیے ''ال'' میں کرنا یا ہونا شامل ہے۔ پنجاب والوں نے ''وداع کیا'' کو ''ودیا کیتا'' بنا لیا ہے۔

فی صد۔ فی صدی:

اس پر پہلے بھی لکھا جا چکا ہے کہ ''سو میں سے ایک'' کو ''فی صد'' کہتے ہیں۔ فی صدی غلط العوام ہے۔ اصل میں لاطینی زبان میں ۱۰۰ کو Cent کہتے ہیں، لہٰذا انگریز نے سو سال یا کرکٹ کے رنز کی گنتی میں سو کے لیے صدی (سنچری... Century) کا لفظ استعمال کر کے ہم (نقالوں) کو باقی معاملات میں بھی ترقی یافتہ قوم کہلانے کا شرف بخش دیا۔ اب ہم ایسے جملے بول رہے

ہیں: ''مجھے سو فیصدی یقین ہے۔'' ''ہم کو فلاں سودے میں پچاس فی صدی منافع (یا نقصان) ہوا۔''

خدا کے بندو! یہ تو دیکھو کہ انگریز ''سودے'' میں فی صد ''Per cent'' کہتا ہے، ''Per Century'' ہرگز نہیں کہتا، جب کہ ہم نے اعتماد اور یقین کو بھی ''صدی'' کے تابع کر دیا۔ صدی سو سال کے لیے ہے، نفع نقصان وغیرہ کی شرح کے لیے نہیں...!

کہکشاں کی جمع:

ہم بے خیالی میں کہکشاں (Milky Way) کی جمع ''کہکشائیں'' لکھتے ہیں اور کہکشاں کا آخری حرف (نون غنہ) نظر انداز کر دیتے ہیں... اس کی جمع کہکشانیں ہے، کہکشائیں نہیں...![1]

نکہت۔ نگہت:

''نَکْہَتْ'' فارسی لفظ ہے جس کے معنی خوشبو، پھول کی مہک ہے۔ موسم بہار میں پھول کھلتے ہیں تو ان کی خوشبو ہوا میں بھی دور تک جاتی ہے۔ کسی رنجیدہ خاطر شاعر کو ایسی ہی مہکتی ہوا کا جھونکا آیا تو اس نے اس کو مخاطب کر کے کہا ؎

نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بے زار بیٹھے ہیں

[1] یہاں یہ بھی بتا دیں کہ فارسی لفظ ''کہ'' کا معنی گھاس ہے اور ''کشاں'' (کھینچنے والا) مصدر کشیدن سے ہے۔ چونکہ کہکشاں میں ستارے اور سیارے گھاس کی پتیوں کی طرح بکھرے نظر آتے ہیں، لہٰذا یہ نام پڑ گیا۔ (فارانی)

آشفتہ خاطری میں خوشبو بھی بری لگتی ہے۔ یہ انشاء اللہ خاں انشاء کی بڑھاپے کی غزل ہے جب وہ شاہی دربار سے بھی معطل ہو گئے تھے!

''نَکْہَتْ'' (نون اور ہا پر زبر اور کاف ساکن) سے فارسی میں غلط العام ''نگہت'' رائج ہے (گاف کے ساتھ) اور نون کو ''زیر'' کر دیا ہے، چنانچہ ہمارے ہاں لڑکیوں کا نام گاف ہی سے پکارا، بلکہ لکھا بھی جاتا ہے۔ بہر حال اصل لفظ نکہت ہے۔

آراستہ۔ بہرہ ور:

ایک جگہ یہ عبارت نظر آئی: ''فلاں صاحب اچھے خاصے علم وفضل کے زیور سے بہرہ ور تھے۔'' حالانکہ زیور سے آراستہ لکھنا چاہیے تھا۔ زیور زینت کے لیے ہوتا ہے اور زینت کا ترجمان لفظ آراستہ ہی مستعمل ہے۔ لکھنے والے فاضل کچھ زیادہ ہی فاضل ہونے کا ثبوت دینے کے لیے لفظ ''بہرہ ور'' کو زیادہ موزوں جانتے تھے، اس لیے موصوف کی شان میں اضافہ فرمایا۔ ان کو معلوم نہ تھا کہ بہرہ ور کے معنی ''جاننے والا، واقف، فائدہ اٹھانے والا، خوش قسمت'' وغیرہ ہیں اور یہ آراستہ کے معنوں میں استعمال نہیں ہوتا۔ یاد رہے فارسی لفظ ''بہرہ'' کے معنی ہیں: حصہ، نصیب، قسمت۔

''زبانِ خامہ کی خامیاں''

محمد خالد سیف (اسلام آباد)

مذکورہ بالا عنوان حضرت علیم ناصری سے مستعار لیا گیا ہے۔ آپ اس عنوان کے تحت گاہے گاہے زبان و بیان کی اغلاط کی نشان دہی کر کے، ان کی تصحیح فرماتے رہتے ہیں۔ میں آپ کا یہ مضمون بہت شوق سے پڑھتا اور اس سے استفادہ کیا کرتا ہوں۔ سچی بات یہ ہے کہ آپ کا یہ مضمون ناتجربہ کار لکھاریوں کے لیے بہت ممد و معاون ثابت ہوتا اور راہنمائی کا نور فراہم کرتا ہے۔

''الاعتصام'' کے سابق مدیر باتدبیر اور نامور مصنف و مؤرخ محترم مولانا محمد اسحاق بھٹی رحمہ اللہ بھی اس موضوع پر کبھی کبھی دادِ تحقیق دیتے اور ''الاعتصام'' کو اپنے رشحاتِ فکر سے نوازتے رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہمارے ان دونوں بزرگوں کو علم و ادب سے بہرۂ وافر عطا فرمایا ہے۔ وہ ہمارے لیے باعث صد افتخار اور روشنی کے بلند مینار ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ان سے تادیر اکتسابِ ضیاء کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

درج ذیل سطور میں زبان و بیان ہی سے متعلق چند گزارشات حضرت علیم ناصری کی خدمت میں پیش کرنے کی جسارت کی جا رہی ہے۔ آپ نے ہفت روزہ ''الاعتصام'' کے شمارہ 22 (6 تا 12 جون 2003ء) میں ڈاکٹر

عبدالغفور راشد کی کتاب ''تذکرۃ الابرار'' پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''ثمرہ کوئی لفظ نہیں، صرف ثمر درست ہے۔''

بندہ عاجز کی رائے میں ''ثمرہ'' بھی درست ہے، کیوں کہ یہ لفظ تو قرآن میں بھی استعمال ہوا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ كُلَّمَا رُزِقُوا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا ﴾ [البقرة: ٢٥]

''جب انھیں ان میں سے کسی قسم کا میوہ کھانے کو دیا جائے گا۔''

قرآن مجید کے اس جملے میں ''ثمرہ'' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اس کی جمع ''ثمار'' اور ''ثمرات'' آتی ہے۔ جمع کا صیغہ ثمرات (الف لام کے بغیر نکرہ کی صورت میں) قرآن مجید میں چار بار اور ''الثمرات'' (الف لام کے ساتھ معرفہ کی صورت میں) بارہ بار استعمال ہوا ہے، جب کہ واحد کا صیغہ ''ثمرۃ'' صرف ایک ہی بار مذکورہ بالا آیتِ کریمہ میں استعمال ہوا ہے۔ بہت سی احادیثِ مبارکہ میں بھی ''ثمرۃ'' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔

✿ ایک حدیث میں ہے کہ جب کسی شخص کا بچہ فوت ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرشتوں سے فرماتا ہے: ((قَبَضْتُمْ ثَمَرَةَ فُؤَادِهِ))

''تم نے اس کے دل کے پھل کو قبض کر لیا ہے۔''

✿ ((فَأَعْطَاهُ صَفْقَةَ يَدِهِ وَثَمَرَةَ قَلْبِهِ))

''اس نے آپ ﷺ کو ہاتھ کا سودا اور اپنے دل کا پھل دے دیا۔''

یعنی بیعت کرتے ہوئے اطاعت گزاری اور وفا شعاری کا پختہ عہد کیا۔

امامِ لغت ابن منظور افریقی رحمہ اللہ نے یہاں حدیثِ ابن عباس رضی اللہ عنہما کا حوالہ دیتے

ہوئے لکھا ہے کہ ایک بار آپ ﷺ نے اپنی زبان کے کنارے کو پکڑا ہوا تھا اور فرما رہے تھے کہ اے زبان! اچھی بات کیا کرو، خیر اور بھلائی کو حاصل کر لو گی، اور بری بات سے اجتناب کیا کرو، سلامتی میں رہو گی۔ اس حدیث کی ابتدا میں یہ الفاظ ہیں اور انھی کی طرف توجہ مبذول کرانا مقصود ہے:

''اِنَّهُ اَخَذَ بِثَمَرَةِ لِسَانِهِ'' (لسان العرب: ٤/١٠٦)

''انھوں نے اپنی زبان کے کنارے کو پکڑا۔''

حضرت علیم ناصری صاحبِ طرز ادیب اور قادر الکلام شاعر ہیں۔ آپ کا عظیم الشان شعری کارنامہ یہ ہے کہ آپ نے تحریکِ بالاکوٹ کی ساری تاریخ کو ''شاہنامہ بالاکوٹ'' کے نام سے منظوم کر دیا ہے۔ بندۂ عاجز کو بھی اس مقدس تحریک سے عقیدت ہے۔ جو اپنوں اور بیگانوں کی طرف سے آلام و مصائب کا ہمیشہ تختۂ مشق بنی رہی ہے۔ ''کلامِ شاہ اسماعیل شہید'' اور ''تذکرہ امام محمد اسماعیل شہید'' اسی عقیدت و محبت کا اظہار ہے۔

آپ حیران ہوں گے کہ لفظ ''ثمرہ'' کی بحث میں تحریکِ بالاکوٹ کا ذکر کیسے آ گیا؟ دراصل محترم علیم ناصری صاحب کی توجہ اس جانب مبذول کرانا مقصود ہے کہ حضرت شاہ اسماعیل شہید رحمہ اللہ نے اپنے عظیم علمی و فکری شہکار ''عبقات'' میں خطبہ اور حمد و ثنا کے بعد جو پہلا جملہ لکھا ہے، اس میں یہ الفاظ بھی ہیں:

((ثَمَرَةُ جِنَانِ الْعِبَادَاتِ)) (عبقات، ص: ٢)

''معرفتِ الٰہی عبادات کے باغات کا ثمرہ ہے۔''

اسی طرح سیدی و سندی مولانا محمد حنیف ندوی رحمہ اللہ نے لفظ ثمرہ کی

توضیح وتشریح کرتے ہوئے لکھا ہے:

((ثَمَرَةُ الْعِلْمِ الْعَمَلُ)) (لسان القرآن:۱/۱۷۳)

''علم کا ثمرہ عمل ہے۔''

اس تفصیل سے معلوم ہوا: ''ثمرہ'' اور ثمر دونوں الفاظ صحیح ہیں۔ ''ثمرہ'' واحد ہے، اس کی جمع ثمرات ہے، نیز اس کی جمع ''ثمار'' بھی آتی ہے، جب کہ ثمار کی جمع ''أَثْمَار'' اور ''ثُمُر'' آتی ہے۔ پھل اور میوے کے علاوہ یہ لفظ نسل اور اولاد کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ ''ثَمَرَةُ اللِّسَان'' کے معنی زبان کے کنارے کے ہیں، جیسا کہ قبل ازیں حدیثِ ابن عباس رضی اللہ عنہما کے حوالے سے ذکر کیا جا چکا ہے۔ ''ثَمَرَةُ السَّوْطِ'' چابک کے سرے کی گرہ کو کہتے ہیں۔ ''ثَمَرَةُ الْقَلْبِ'' کے معنی دوستی اور محبت کے ہیں۔ اردو، عربی اور فارسی تینوں زبانوں میں لفظ ''ثَمَرَةُ'' اس قدر کثرت سے استعمال ہوا ہے کہ حیطۂ شمار سے باہر ہے۔

ولی کا شعر ہے ؎

آشنا نونہال سوں ہونا
ثمرۂ گلشنِ جوانی ہے

اور قائم نے کہا ہے ؎

نہیں قائم اگر ثمرہ خجالت سربلندی کا
تو پھل کس واسطے ہر نخل سے ہے سرنگوں ٹپکا

کسی شاعر کا ایک دلچسپ شعر ہے ؎

کچھ بھی غفلت کا نہ ثمرہ پایا
ملی تنخواہ نہ بیکاری کی

اردو زبان کے مشہور ادیب مرزا فرحت اللہ بیگ کا ایک جملہ ہے:

''یہ جلسہ ان احباب کی محنتوں کا ثمرہ ہے جو اردو کو اپنی زبان سمجھتے ہیں۔'' (مضامین:5/3)

مولانا عبدالحلیم شرر کا ایک خوب صورت جملہ ملاحظہ فرمائیں:

''آپ کی دوستی کا یہی ثمرہ ہے۔'' (مضامین:300/3)

اختصار کی کوشش کے باوجود لفظ ''ثمرہ'' کے بارے میں گفتگو طویل ہوگئی ہے ؎

لذید بود حکایت، دراز تر گفتم

بہرحال بندۂ عاجز کی رائے میں ''ثمر'' کی طرح ''ثمرہ'' کا لفظ بھی درست ہے، اس کے استعمال میں کوئی مضائقہ نہیں۔

''الاعتصام'' کے اسی شمارے میں حضرت علیم ناصری حفظہ اللہ کے قلم سے محترم مولانا محمد اسحاق بھٹی کی گلِ تازہ کی طرح کتاب ''کاروانِ سلف'' پر بھی تبصرہ شائع ہوا ہے۔ محترم ناصری صاحب فنِ تبصرہ نگاری میں یدِطولیٰ رکھتے ہیں، اس لیے آپ کا تبصرہ بھی بہت خوب ہوتا ہے۔ اس تبصرے میں آپ نے عرفی کا یہ شعر بھی استعمال کیا ہے اور برمحل استعمال کیا ہے:

حدی را تیز تر می خواں چو محمل را گراں بینی
نوا را تلخ تر می زن چو ذوقِ نغمہ کم یابی

مگر یہ کمپوزنگ کی غلطی ہے کہ پہلے مصرعے کے پہلے لفظ کو ''ہدی'' لکھا گیا ہے، حالانکہ یہ لفظ ''حدی'' ہے۔ ''ہدی'' کے معنی ہدایت کے ہیں، جب کہ

"حدیٰ" کے معنی گا کر اونٹوں کو ہانکنے اور برانگیختہ کرنے کے ہیں۔ "حَدَا" (ن) "حَدْواً" کے معنی حدی پڑھنے میں آواز بلند کرنے کے ہوتے ہیں اور "حَادِیْ" اسے کہتے ہیں جو اونٹوں کو گا کر ہانکے۔ بہر حال توجہ اس جانب مبذول کرانا مقصود ہے کہ شعر میں لفظ حدی ہے، جسے کمپوزنگ کی وجہ سے "ہدی" لکھا گیا ہے۔

اسی تبصرے کے آخری جملے میں الفاظ ہیں:

"ہم بھٹی صاحب کی کارفرمائی پر ان کے ممنون احسان ہیں۔"

میری رائے میں ممنون کے بعد احسان کا لفظ استعمال کرنا حشو (زائد) ہے اور حشوِ کلام بلاغت کے خلاف ہے۔ ممنون کے معنی ہیں: وہ شخص جس پر احسان کیا گیا ہو، جس پر احسان رکھا گیا ہو۔ یہ احسان مند اور شکر گزار کے معنی میں ہے۔ ؎

کوئی بھی پرسشِ حالِ دلِ محزوں نہ کرے
میرا اللہ مجھے تا دم ممنوں نہ کرے

ایک مکتوب

پروفیسر محمد سعید عابد

جنابِ علیم ناصری صاحب ہمارے صاحبِ سیف وقلم بزرگ ہیں۔ کتابوں پر ان کے تبصرے نہایت جاندار، حقیقت پسندانہ اور متوازن ہوتے ہیں۔ موصوف زبان وادب کی خوبیوں اور خامیوں کے ماہر نباض ہیں۔ تراکیب ومحاورات اور مفردات کے معانی ومبانی، ان کے محلِ استعمال اور فنی باریکیوں پر گہری نگاہ رکھتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ شعر وادب کے طالب علم ان کے فاضلانہ تبصروں سے بہت کچھ سیکھتے ہیں۔

"الاعتصام" کے تازہ شمارے میں دو کتابوں پر ان کا اظہارِ خیال حسبِ سابق ان کے منفرد اسلوبِ نقد وتبصرہ کا مظہر ہے۔ محترم محمد اسحاق بھٹی صاحب رحمہ اللہ سے ان کی معاصرانہ دل لگی اور شاعرانہ چٹکیاں، شگفتہ اور کچھ نہفتہ نقد اور بے لاگ تبصرے خوب ہی لطف دے گئے۔

محترم ڈاکٹر عبدالغفور راشد کی تصنیف گلنار بعنوان "تذکرۃ الابرار" پر بھی ان کا تبصرہ بہت پسند آیا۔ راشد صاحب کی جگہ میں ہوتا تو بصد تشکر عرض کرتا:

"صاحب! تمھارے نقد نے سب بل نکال دیے۔" البتہ یہ فرما کر کہ "ثمرہ" کوئی لفظ نہیں صرف ثمر درست ہے، "اک بل دیا ہے ڈال۔"

اردو، عربی اور فارسی کی جملہ کتبِ لغت میں ''ثمرۃ'' موجود ہے، حتی کہ قرآنِ حکیم میں بھی وارد ہے۔[البقرۃ: ۲۵]

اربابِ فن جانتے ہیں کہ اس میں ''ۃ'' اِفراد کا ہے۔ ثمرات اسی ثمرہ کی جمع ہے۔ ''تمر'' اور ''تمرۃ''، ''شجر'' اور ''شجرۃ''، ''نمل'' اور ''نملۃ''، ''نحل'' اور ''نحلۃ اور ''نخل'' اور ''نخلۃ'' اس کی دیگر مثالیں ہیں۔ یہ امر ناصری صاحب سے بھی یقیناً مخفی نہیں۔ مگر ''الخطأ والنسیان من فطرة الإنسان، والكمال لله وهو الرب السبحان''

نیاز کیش، محمد سعید عابد

گورنمنٹ اسلامیہ ڈگری کالج، قصور

نامہ ہائے نام وراں

جناب علیم ناصری

نامور اہلِ قلم احباب کے نامہ ہائے گراں قدر مختلف امور و مسائل کے سلسلے میں ایک عرصے سے ''الاعتصام'' کی زینت بنتے آ رہے ہیں، وہ خواہ کسی مسئلے میں ہمارے مفتی صاحب کے فتوے کا تعاقب ہو یا کسی غلط فہمی کی صحت کا تقاضا ہو۔ ایسے خطوط مولانائے مرحوم حضرت الشیخ عطاء اللہ حنیف رحمہ اللہ کے زمانے کے ہوں یا تازہ ترین دور کے، ''الاعتصام'' میں اپنی کوتاہی یا برادرانہ اختلاف کے برادرانہ مباحث شائع کرنے میں کسی بخل سے کام نہیں لیا گیا، البتہ ''زبانِ خامہ کی خامیاں'' پر احباب نے بہت کم قلم فرسائی کی ہے۔

چند سال پیشتر ہمارے ایک عزیز نے جدہ سے یہ شکوہ کیا تھا کہ ''الاعتصام'' میں چھپنے والی اغلاط الم نشرح ہونے کے باوجود دوبارہ اہلِ قلم کی عبارات میں پائی جاتی ہیں۔ گو اس قسم کے واقعے کی ذمے داری ادارے پر نہیں ہوتی، تاہم اس غلطی کو پھر سے شائع نہ کرنا ہمارا فریضہ ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو اپنی اغلاط پر توجہ دینے کی توفیق عطا فرمائے۔

اس موضوع پر بھرپور گرامی نامے دو احباب کی طرف سے لفظ ''ثمرۃ'' کے سلسلے میں موصول ہوئے تھے، جن کی اشاعت (من وعن) جلد نمبر 55 کے

شمارہ نمبر 25 (بتاریخ 27/ جون 2003ء) میں کر دی گئی تھی۔

اس کے جواب کی ذمے داری راقم الحروف (علیم ناصری) پر تھی، مگر گذشتہ دو ہفتوں سے زیادہ دن گزر گئے کہ میں بسترِ علالت سے کچھ لکھنے کے قابل نہیں تھا، تاہم اب اپنے نامور احباب (جناب محمد خالد سیف اور عزیزم پروفیسر محمد سعید عابد) سے معذرت کرتے ہوئے چند الفاظ لکھنے کی جسارت بسترِ علالت ہی سے کر رہا ہوں۔

مجھے تہ دل سے تسلیم ہے کہ لفظ ثمر کے ساتھ ثمرہ بھی بامعنی لفظ اور عام مستعمل رہا ہے، البتہ اس کو عربی عبارات (قرآن و احادیث) اور دیگر مقامات پر خوب استعمال کیا گیا ہے، جس کی مثالیں محترم سیف صاحب نے پیش فرمائی ہیں۔ اردو میں بھی اس کے استعمال کی مثالیں پیش کرتے ہوئے نثر و نظم سے مثالیں لائے ہیں اور ان کے دلائل و براہین کا وزن میرے لیے کمر شکن ہو گیا۔ میں اس غلطی اور اپنی کوتاہ نظری پر سخت نادم ہوں اور لغت سے رجوع کیے بغیر اپنا فیصلہ سنانے میں عجلت پر بھی سر بگریباں ہوں۔

مولانا سیف نے مولانا عبدالحلیم شرر کا یہ جملہ لکھ کر مجھے حیران کر دیا: ''یہ بہت خوب صورت جملہ ہے: آپ کی دوستی کا یہی ثمرہ ہے۔'' میں نے اپنی باریک بیں عینک سے اِس جملے میں حسن و جمال اور خوب صورتی کی جھلک تلاش کرنے کی کوشش کی، مگر وائے افسوس کہ میری کوتاہ نگاہی یہی پا سکی کہ مندرجہ ذیل شعر بھی اس قسم کا خوب صورت اور سچائی کا مظہر ہے ؎

چشمانِ تو زیرِ ابروان اند
دندانِ تو جملہ در دہان اند

''آپ کی آنکھیں ابروؤں کے نیچے ہیں اور آپ کے تمام دانت آپ کے منہ کے اندر ہیں۔''

اور یہ ایسی سچائی ہے (خوب صورتی ہے) کہ اس کا جواب نہیں۔ تاہم مجھے اپنی اس غلط گوئی کا شدید احساس ہوا کہ ''ثمرہ کوئی لفظ نہیں'' اللہ تعالیٰ میری اس لغزش کو معاف فرمائے۔ آپ حضرات کی گرفت درست بلکہ واقعی درست ہے۔

عزیزم پروفیسر سعید عابد اور جناب سیف صاحبان کا ''ممنونِ احسان'' ہوں کہ مجھ پر احسان فرما گئے ہیں۔ حُدی کی کتابت (کمپوزنگ) میں غلطی کی نشاندہی کا بھی شکر گزار ہوں۔

سیف صاحب سے عرض کروں گا کہ ''ممنونِ احسان'' عام استعمال میں آتا ہے اور دو ہم معنی الفاظ مرکبِ عطف میں آتے ہیں، ان کی معنویت کی یکسانیِ ان کے حصر کے لیے ہوتی ہے۔ تائید مزید کے لیے عرض ہے کہ ایسے ہی اور بھی کئی الفاظ ایک ہی معنی رکھنے کے باوجود ترکیبِ اضافی یا عاطفہ میں باندھے جا سکتے ہیں، جیسے: علم و عرفان، مسرت و شادمانی، رعنائی و زیبائی وغیرہ۔

امید ہے ہمارے یہ علمی محسنین آیندہ بھی ہماری اغلاط پر گرفت اور الفاظ کی صحیح تعبیر و تشریح سے ممنون فرماتے رہیں گے۔

ہم دوسرے اہلِ قلم حضرات سے بھی گزارش کریں گے کہ وہ بھی ہماری ایسی کوتاہیوں کی اطلاع دیتے رہا کریں۔ اس طرح ''الاعتصام'' کے کارکنان اور قارئین میں قربت و محبت کے رشتے استوار ہوں گے اور علمی خدمات کا سلسلہ

رواں دواں رہے گا۔ ان شاء اللہ العزیز!

یہی طرزِ عمل دورِ حاضر میں چیک اینڈ بیلنس کہلاتا ہے اور تازہ ترین زبان میں ڈیٹرینٹ (Deterrent)، اور ہمارے نامور احباب نے اس کا ثبوت فراہم کر دیا ہے۔ ایک مصرع ادنیٰ تصرف کے ساتھ ؎

ایں کار از ''شماست'' و مرداں چنیں کنند

نیاز مند

علیم ناصری

اپنی ماضی:

''ماضی'' گزرے ہوئے زمانے کو کہتے ہیں اور یہ مذکر ہوتا ہے، مؤنث نہیں، لہٰذا یہ کہنا: ''ہمیں اپنی ماضی سے سبق لینا چاہیے'' غلط ہے، اپنے ماضی کہنا چاہیے۔ مذکر کی ایک اور مثال ہے: ''ہمارا ماضی بہت تابناک رہا ہے۔''

گرہ:

اس کے معنی گانٹھ کے ہیں۔ اس کی جمع ''گرہیں'' ہے اور لکھنے میں بھی ہائے ہوز (ہ) الگ لکھی جائے گی اور اس کی آواز بھی الگ ہوگی۔ بعض حضرات جمع کو ''گرھوں'' لکھتے ہیں جو غلط ہے۔ اس طرح ہ ہوز نہیں رہتی، مخلوط (ہندی) ہو جاتی ہے، جو ''رھ'' کی صورت میں ایک لفظ ہوگا، جیسے: گڑھ، مظفر گڑھ، رام گڑھ وغیرہ۔

کرنے لگ جاتے ہیں:

ایک عبارت ہے ... ''بچے اپنے بڑوں کو دیکھ کر ان کی نقل کرنے لگ جاتے ہیں۔'' اس میں ''جاتے'' اضافی لفظ ہے۔ ''کرنے لگتے ہیں'' ہی کافی ہے۔

... بجے سے لے کر ... بجے تک:

ایک عبارت عموماً یوں لکھی جاتی ہے:

"ہمارا جلسہ 8 بجے سے لے کر 12 بجے تک جاری رہے گا۔"

اس میں وقت کے ساتھ "لے کر" ایک اضافی ٹکڑا مستعمل ہے جو عبارت کی سلاست کو خراب کرتا ہے۔ صرف یہی کافی ہے:

"ہمارا جلسہ 8 سے 12 بجے تک جاری رہے گا۔"

(پاؤں وغیرہ) درد کرتا ہے:

یہ جملے عام ہیں: میرا سر درد کرتا ہے۔ میرا پاؤں درد کرتا ہے۔ میرا پیٹ درد کرتا ہے۔

یہ تمام جملے غلط ہیں۔ درد کرنا نہیں، بلکہ "میرے سر میں درد ہے، میرے پاؤں میں درد ہے۔" وغیرہ بولتے ہیں، البتہ ہندی انداز ہے: "میرا سر دکھتا ہے، میرا پیٹ دکھتا ہے۔" وعلیٰ ہذا القیاس۔

فارسی الفاظ کی جمع میں "ہا" یا "ہائے" کا استعمال:

ایک کالم نگار لکھتے ہیں:

"ہمارے اربابِ ہائے اقتدار ہوش کے ناخن لیں۔"

"ارباب" عربی لفظ "رب" کی جمع ہے، لہٰذا اس کے ساتھ فارسی علامتِ جمع "ہائے" کا استعمال غلط ہے۔ ارباب ہی کافی تھا۔ عربی لفظ "رب" کی جمع پہلے سے موجود ہے، اس لیے فارسی وغیرہ سے اس کو بوجھل کرنا سراسر غلط ہے۔

آپ:

"آپ" ایک ایسا لفظ ہے جو کسی دوسرے کی عزت افزائی کے لیے بولا جاتا ہے، مثلاً: "بہت سے دوستوں سے آپ کی تعریف سنی تھی، آج زیارت بھی

ہو گئی۔" یہ لفظ مخاطب کے لیے تو نہایت موزوں ہوتا ہے، مگر لوگ کسی کی عدم موجودگی میں بھی احتراماً بولتے ہیں، جیسے: "محترم نذیر احمد صاحب بہت بلند شخصیت کے مالک ہیں۔ جب بھی آپ کی یاد آتی ہے تو دل ان سے ملاقات کے لیے بے تاب ہو جاتا ہے۔"

یہی لفظ جب آپ کسی شخص کو خط میں لکھتے ہیں تو گویا وہ آپ کا مخاطب ہونے کے باعث سامنے ہوتا ہے، لہٰذا "آپ" کا لفظ بالکل موزوں ہوتا ہے۔ اسی خط میں باتوں باتوں میں کسی بزرگ کا ذکر ہونے لگتا ہے جو دونوں کے لیے محترم ہوتا ہے تو اس کی غیر موجودگی میں جب ان کے محاسن بیان کرتے کرتے لفظ "آپ" کا استعمال متعدد بار آتا ہے تو بعض جملوں کی ترکیب خط کے مخاطب کی طرف ہوتی ہے اور پھر لفظ آپ کے ساتھ وہ جملہ اسی غیر حاضر کے لیے ہوتا ہے۔

یہ "آپ" خط کے مخاطب کو اپنی طرف محسوس ہونے لگتا ہے۔ بہتر یہ ہے کہ غیر حاضر شخصیت کے لیے غیر حاضری میں "وہ" کا لفظ استعمال کیا جائے۔ اس میں کوئی سبکی کا پہلو نہیں، جب کہ لفظ "آپ" میں مغالطے کا پہلو ہوتا ہے۔

فکر (مؤنث) فکر (مذکر):

فکر (مؤنث): پروا، تشویش، پریشانی۔

مثلاً: "میرا بیٹا ہسپتال میں زیرِ علاج ہے، مجھے ہر وقت اس کی فکر لگی رہتی ہے۔" ... یا ... "آج کل چوروں کی بہتات ہو گئی ہے، اس لیے ہر شخص کو اپنے گھر بار اور مال مویشی کی فکر ہونی چاہیے۔" ... یا ... "کاروبار میں گھاٹا پڑ گیا

ہے، اس لیے اپنے اہل و عیال کی گزران کے لیے بہت فکر مند ہوں۔"

کسی شاعر نے کہا تھا ؎

یا رب بتا کہ کیا ہے مری فکر کا علاج
دنیا بھی ہے تو سامنے عقبیٰ نظر میں ہے

فکر (مذکر): خیال، سوچ، بلند نظری۔

مولانا جلال الدین رومی کا فکر اتنا بلند تھا کہ علامہ اقبال نے جگہ جگہ ان سے راہنمائی کا اقرار کیا ہے، ایک جگہ لکھتے ہیں ؎

مدت سے ہے آوارۂ افلاک مرا فکر
کر دے اسے اب چاند کے غاروں میں نظر بند

شر:

یہ عربی لفظ ہے جس کے معنی: بدی، شرارت، جھگڑا، فساد وغیرہ ہیں۔ عربی میں اس کے دوسرے حرف "ر" پر تشدید ہے، جیسے: ﴿مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ﴾۔ اور مرکبات میں بھی، جیسے: ﴿مِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ﴾۔ لیکن فارسی اور اردو میں "ر" کی تشدید ختم کر دی گئی ہے اور معنی میں کوئی فرق نہیں ہے۔ شر انگیزی (فارسی) بدی کو ابھارنا یا پیدا کرنا یا زیادہ کرنا وغیرہ۔ اردو میں ہے ؎

منہ سنبھالو یہ گالیاں کیا خوب
خیر سے بڑھ چلا ہے شر دیکھو

البتہ بعض لمبے الفاظ میں شر (ش ر) شامل ہے، وہاں "ر" پر شد ہے، مثلاً: "شرّاٹے" بارش کے زور سے برسنے کو کہتے ہیں ؎

شرّاٹے مینہ کے ہیں، بادل گرج رہے ہیں
نقارے سے فلک پر کچھ آج بج رہے ہیں

(انشا)

گالیاں یا گالی ... دینا، سننا وغیرہ کے ساتھ:

ہمارے ہاں پنجابی میں گالیاں نکالنا یا گالی نکالنا مشہور ہے۔ اردو میں گالی دینا یا گالی سننا ہے اور گالی نکالنا غلط ہے۔ گالیاں دینا، گالیاں لینا، گالیاں سننا، گالیاں کھانا وغیرہ سب درست ہے، مگر گالیاں نکالنا غلط ہے۔ گالیاں دینا کہنا ہی درست ہے۔ (گو گالیاں دینا خلافِ تہذیب ہے)

جوتا ڈالنا۔ جرابیں ڈالنا وغیرہ:

ہمارے ہاں پنجابی میں لفظ "پانا" بہت عام ہے، جیسے: کپڑے پانا، جوتا پانا، گلاس میں پانی پانا، تھالی میں سالن پانا وغیرہ۔ یہ جتنے "پانا" ہیں اردو میں ان کے بجائے "ڈالنا" استعمال ہوتا ہے، مثلاً: جوتا پانا کو ڈالنا نہیں، پہننا کہیں گے۔ جرابیں، کپڑے وغیرہ بدن پر "پہننا" کہا جائے گا، ڈالنا غلط ہو گا۔ باقی گلاس میں پانی، تھالی میں سالن وغیرہ ڈالنا ہی درست ہو گا۔ بچے کو بستر پر پانا نہیں لٹانا ہو گا۔ لڑکے کو پڑھنے پایا نہیں، سکول میں داخل کیا کہا جائے گا ... اسی طرح یہ پنجابی "پانا" کسی اور مقام پر بھی استعمال ہوتا ہو، اس کا ترجمہ اردو میں حسبِ حال کیا جائے گا۔

"لا" سے بنائے گئے الفاظ:

"لا" عربی کا حرفِ نفی ہے۔ ہمارے ہندوستانی بزرجمہروں نے "لا" کے ساتھ بہت سے الفاظ بنا رکھے ہیں، مثلاً: لاپتہ، لاپروا، لاچار۔ شاید کچھ اور بھی ہوں، مگر یہ تین الفاظ بہت استعمال ہوتے ہیں اور تینوں غلط ہیں۔ زبان کے قواعد کے تحت عربی لفظ کے ساتھ اردو، ہندی الفاظ کو ملا کر مرکب بنانا سراسر غلط ہے۔ "لاچار" کو فارسی میں "ناچار" کہا گیا ہے اور یہ فارسی مرکب درست ہے۔

لاپتا (غائب) جس کی خبر نہ ہو۔ "لا" (عربی) کے ساتھ "پتا" (اردو، ہندی) بالکل غلط ہے۔ ایسے ہی "لاپروا" ہے، جس کو "بے پروا" لکھنا چاہیے اور پروا کے آخر میں "ہ" لکھنا بھی غلط ہے۔

برات۔ بارات:

"بارات" کوئی لفظ نہیں ہے۔ "برات" قسمت کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے، جیسے کہتے ہیں: "فلاں چیز میری برات میں نہ تھی، لہٰذا گم ہو گئی۔" اقبال کا مصرع ہے ؎

شاخِ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات

شادی میں دلہن لانے کے لیے جو عزیز و اقارب کی ایک جماعت جاتی

ہے، اس کو بھی "برات" کہتے ہیں۔ یہ "بر" (خاوند) اور "آت" (آنا) سے مرکب ہے۔ اس کو "بارات" لکھنا یا بولنا غلط ہے۔

درستی۔ درستگی:

یہ لفظ "درست" کے حاصل مصدر کے طور پر بہت استعمال ہوتا ہے جو سراسر غلط ہے۔ اس کو "درستی" کہنا چاہیے۔ حاصل مصدر کی علامت "گی" ایسے الفاظ کے ساتھ ہوگی جن کے آخر میں "ہ" آتی ہے، مثلاً: آراستہ سے آراستگی، شکستہ سے شکستگی، خواندہ سے خواندگی، زندہ سے زندگی، بندہ سے بندگی وغیرہ۔

بگٹٹ۔ بھگٹٹ:

یہ لفظ باگ ٹُٹ کا مجموعہ ہے، یعنی وہ گھوڑا جس کی باگ (لگام) ٹوٹ گئی ہو اور وہ قابو سے باہر ہو گیا ہو۔ اسی مفہوم کے تحت وہ شخص جو اپنی مرضی آزادانہ استعمال کرے اور کسی کے مشورے پر بھی کان نہ دھرے، اسے بگٹٹ کہہ سکتے ہیں۔ اس کے معنی معلوم نہ ہونے کی وجہ سے بعض لوگ اس کو بھگٹٹ لکھتے ہیں جو غلط ہے۔

ذخار۔ زخّار:

ذخّار (ذال کے ساتھ) لغات میں کوئی لفظ نہیں۔ ذخیرہ، (محفوظ کردہ سامان) سے اس کو نسبت نہیں۔ اس کی املا "زخّار" (ز کے ساتھ) ہے، جس کے معنی لبالب بھرا ہوا، امنڈنے والا ہیں۔ یہ بحر کے ساتھ مستعمل ہے، جیسے: بحرِ زخّار۔ جو "بحرِ ذخّار" لکھتے ہیں، وہ غلط ہے۔

درویش:

دروازوں سے لگ کر (بھیک) مانگنے والا۔ یہ اصل میں دَر آویز کا بگڑا ہوا لفظ ہے۔ در آویز یعنی دروازے سے لپٹنے والا۔ یہ لفظ بدنام بھی ہو گیا تھا اور بھکاری کے معنوں میں استعمال ہونے لگا تھا، لیکن اہلِ تصوف نے اپنے آپ کو عاجز اور سبکسار ظاہر کرنے کے لیے اپنے آپ کو درویش کہنا شروع کر دیا اور لوگوں نے بزرگوں کے لیے درویش کا استعمال شروع کر دیا۔ لیکن (بقولِ مرتب غیاث اللغات) بزرگوں کے لیے یہ کچھ موزوں نہیں تھا، اس لیے بعض اہلِ علم نے دُرویش (دال پر پیش) کا لقب پیش کیا، جس کا معنی دُروَش، یعنی موتی جیسا گراں بہا شخص ہے۔

یہ غیاث اللغات کے مرتب محترم محمد غیاث الدین (رامپوری) کا نظریہ ہے اور یہ ایک عقیدت مند توجیہ تھی جو کسی مشہور لغات میں نہیں۔ ہر جگہ دَرویش (دال پر زبر کے ساتھ) ہے اور اس کے معانی سائل اور بھکاری کے ساتھ ہی بزرگ، عاجز و مسکین اور اللہ والے بھی ہیں۔ بزرگوں کے عجز و انکسار کی وجہ سے اب ''درویش'' کا معنی بزرگ ہی لیا جاتا ہے۔ لغات خواہ کچھ کہتی رہے، اب ''دَرویش'' کسی بھکاری یا گداگر کو نہیں کہا جاتا، بلکہ یہ پاکباز بزرگوں ہی کا لقب بن گیا ہے جو عقیدت و ارادت مندی کا مظہر ہے، لہٰذا ''دُرویش'' (دال پر پیش) کا تکلف ضروری نہیں۔

بروز بدھ وار کو:

ایک عبارت ہے: ''میرا بھائی بروز بدھ وار کو شہر سے آیا۔''

اس میں دو غلطیاں ہیں:

① بروز بدھ وار: روز ''فارسی'' میں دن کو کہتے ہیں اور ''وار'' ہندی میں دن کو کہا جاتا ہے، اس لیے ان میں سے ایک لفظ استعمال ہو گا، یعنی بروز بدھ کہنا یا لکھنا درست ہے۔

② روز کے ساتھ ''ب'' اور وار کے بعد ''کو'' بھی ہم معنی ہیں، اس لیے جب ''کو'' استعمال ہو گا تو ''ب'' کا استعمال ختم ہو جائے گا۔

اب یہ جملہ چونکہ ہندی دن یعنی بدھ سے متعلق ہے، اس لیے پوری عبارت اب ہندی (اردو) میں یوں درست ہو گی:

''بدھ وار کو میرا بھائی شہر سے آیا۔'' یا ''بدھ کو.....''

ناکامیاب نہیں رہا:

عبارت ہے: ''ہمارا سپہ سالار حملہ کرنے میں ناکامیاب نہیں رہا۔''

اس جملے میں ایک غلطی ہے۔ اکثر لوگ کہتے ہیں: ناکامیاب نہیں رہا۔ کامیاب کا منفی جملہ ''ناکام نہیں رہا'' درست ہے۔

بوقت 2 بجے:

ایک جملہ ہے: ''فلاں ریل گاڑی آج بوقت 2 بجے پہنچ رہی ہے۔'' جب دو بجے لکھا جائے تو ''بوقت'' لکھنا ضروری نہیں۔ ''بجے'' وقت ہی کے لیے دوسرا لفظ ہے۔ اس لیے یہ جملہ اس طرح درست ہوگا: ''فلاں ریل گاڑی آج دو بجے پہنچ رہی ہے۔''

ترامیمیں:

ترمیم درستی یا تبدیلی کو کہا جاتا ہے۔ اس کی جمع ترامیم اور ترمیمیں (اردو، ہندی) ہیں۔ اس کی جمع الجمع ترامیمیں بالکل غیرضروری ہے۔ جملے میں ترامیم یا ترمیمیں لکھنا چاہیے۔

صبرِ جمیل:

تعزیتی خطوط میں لوگ دعائے مغفرت کے ساتھ مرحوم کے لواحقین کے لیے صبر کی دعا بھی کرتے ہیں، یعنی ''اللہ تعالیٰ آپ کو صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائے۔'' لیکن بعض حضرات صبرِ جمیل کے بجائے صبر و جمیل لکھتے ہیں۔ صبرِ جمیل تو مرکب توصیفی ہے، یعنی بہترین یا عمدہ صبر، لہٰذا صبر و جمیل لکھنا غلط ہے، اس سے جملہ بے معنی یا بے ڈھب ہو جاتا ہے۔ صبر اور جمیل سے کچھ معنی نہیں بنتا۔

مضمون وغیرہ میں قارئین کو بار بار مخاطب کرنا:

بعض مضمون نگار اپنی تحریروں میں قارئین کو مخاطب کرنے کے لیے ''قارئین'' لکھ کر مخاطب کرتے ہیں۔ یہ عموماً ان لوگوں کی تحریروں میں ہوتا ہے

جو خطیب ہوتے ہیں۔ وہ اپنی تقریر میں بھی ''سامعین'' کہہ کر مخاطب کیے رکھتے ہیں اور تحریر میں بھی قارئین لکھنے کے عادی ہو جاتے ہیں۔ یہ طریقِ تحریر مضحکہ خیز ہوتا ہے۔ مضمون پڑھنے والا شخص پہلے ہی پوری توجہ سے پڑھ رہا ہوتا ہے، اس لیے وہ کسی تخاطب کا محتاج نہیں ہوتا۔ اہلِ قلم خیال فرمائیں!
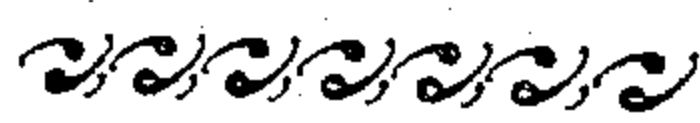
کوئی درجن بھر کے قریب:

عبارت کا یہ ٹکڑا کسی چیز کی نامعلوم گنتی کے لیے استعمال کرتے ہیں، لیکن یہ ٹکڑا ''کوئی درجن بھر'' یا ''درجن کے قریب'' لکھنا چاہیے۔ ''کوئی'' لفظ نامعلوم گنتی کو ظاہر کرتا ہے۔ بیان کردہ گنتی کے قریب لکھنا ہو تو ''کوئی'' لکھا جائے گا۔

قریباً قریباً:

کسی نامعلوم گنتی کو بیان کرنے کے لیے ایک اندازاً ہندسے کے ساتھ تقریباً لکھا جائے گا، جیسے: ''آج فلاں جلسے میں حاضرین تقریباً پانچ ہزار تھے۔'' قریباً قریباً پنجابی ایجاد ہے، اردو میں اس کا استعمال نہیں ہوتا، بلکہ اس کی جگہ قریب قریب لکھا جاتا ہے، یعنی لگ بھگ۔

تا۔ تک:

یہ دونوں الفاظ ہم معنی ہیں۔ بعض جگہ بے خیالی میں لکھا ہوتا ہے: ''ٹورنامنٹ پندرہ تا پچیس اگست تک کھیلا جائے گا۔'' ان دونوں میں صرف ایک کا استعمال ہونا چاہیے اور جملہ یوں لکھا جائے گا: ''(فلاں) ٹورنامنٹ پندرہ سے پچیس اگست تک کھیلا جائے گا۔'' یا ''پندرہ تا پچیس اگست کھیلا جائے گا۔''

''إِنْ شَاءَ اللّٰهُ'' ۔ ''إِنْشَاءَ اللّٰهُ'':

ہمارے ہاں اردو رسائل و جرائد اور عام تحریروں میں کہیں ''إِنْشَاء اللّٰهُ''

اور کہیں ''إِنْ شَاءَ اللّٰهُ'' لکھا ہوتا ہے۔ ان میں سے درست کیا ہے؟

''إِنْشَاء اللّٰهُ'' درست نہیں ہے، درست إِنْ شَاءَ اللّٰهُ ہے، لیکن بڑے بڑے ادیبوں اور تعلیم یافتہ لوگوں کی تحریروں میں یہ غلطی عام نظر آتی ہے۔

قرآن مجید میں یہ جملہ چھے مقامات پر آیا ہے:

① ﴿قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ إِنَّ الْبَقَرَ تَشَابَهَ عَلَيْنَا وَإِنَّآ إِنْ شَآءَ اللّٰهُ لَمُهْتَدُونَ ﴿٧٠﴾﴾ [البقرة:٧٠]

''پھر وہ (یہود) بولے: اپنے رب سے صاف صاف پوچھ کر بتاؤ کہ کیسی گائے مطلوب ہے؟ ہمیں اس کی تعیین میں اشتباہ ہو گیا ہے۔ اللہ نے چاہا تو ہم اس کا پتا پالیں گے۔''

② ﴿فَلَمَّا دَخَلُوا عَلٰى يُوسُفَ اٰوٰىٓ إِلَيْهِ أَبَوَيْهِ وَقَالَ ادْخُلُوا مِصْرَ إِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِينَ ﴿٩٩﴾﴾ [يوسف:٩٩]

''پھر جب لوگ یوسف علیہ السلام کے پاس پہنچے تو انھوں نے اپنے والدین کو اپنے ساتھ بٹھا لیا اور اپنے سب کنبے والوں سے کہا: ''چلو اب شہر میں چلو، اللہ نے چاہا تو امن چین سے رہو گے۔''

③ ﴿قَالَ سَتَجِدُنِيٓ إِنْ شَآءَ اللّٰهُ صَابِرًا وَّلَآ أَعْصِي لَكَ أَمْرًا ﴿٦٩﴾﴾ [الكهف:٦٩]

''موسیٰ علیہ السلام نے (خضر سے) کہا: ان شاء اللہ آپ مجھے صابر پائیں گے اور میں کسی معاملے میں آپ کی نافرمانی نہیں کروں گا۔''

④ ﴿قَالَ إِنِّيٓ أُرِيدُ أَنْ أُنْكِحَكَ إِحْدَى ابْنَتَيَّ هٰتَيْنِ عَلٰىٓ أَنْ تَأْجُرَنِي ثَمٰنِيَ حِجَجٍ فَإِنْ أَتْمَمْتَ عَشْرًا فَمِنْ عِنْدِكَ وَمَآ أُرِيدُ أَنْ أَشُقَّ عَلَيْكَ

سَتَجِدُنِیۡۤ اِنۡ شَآءَ اللّٰہُ مِنَ الصّٰلِحِیۡنَ ﴿۲۷﴾ ﴾ [القصص: ۲۷]

"اس (شعیب علیہ السلام) نے (موسیٰ علیہ السلام سے) کہا: میں چاہتا ہوں کہ اپنی ان دو بیٹیوں میں سے ایک کا نکاح تمھارے ساتھ کر دوں، بشرطیکہ تم آٹھ سال تک میرے ہاں ملازمت کرو اور اگر دس سال پورے کر دو تو یہ تمھاری مرضی ہے۔ میں تم پر سختی نہیں کرنا چاہتا، تم ان شاء اللہ مجھے نیک آدمی پاؤ گے۔"

۵ ﴿ فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعۡیَ قَالَ یٰبُنَیَّ اِنِّیۡۤ اَرٰی فِی الۡمَنَامِ اَنِّیۡۤ اَذۡبَحُکَ فَانۡظُرۡ مَا ذَا تَرٰی ؕ قَالَ یٰۤاَبَتِ افۡعَلۡ مَا تُؤۡمَرُ ۫ سَتَجِدُنِیۡۤ اِنۡ شَآءَ اللّٰہُ مِنَ الصّٰبِرِیۡنَ ﴿۱۰۲﴾ ﴾ [الصافات: ۱۰۲]

"وہ لڑکا جب اس کے ساتھ دوڑ دھوپ کی عمر کو پہنچ گیا تو (ایک روز) ابراہیم علیہ السلام نے اس سے کہا: "بیٹا، میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ میں تجھے ذبح کر رہا ہوں۔ اب تو بتا، تیرا کیا خیال ہے؟" اس نے کہا: ابا جان، جو کچھ آپ کو حکم دیا جا رہا ہے اسے کر ڈالیے۔ آپ ان شاء اللہ مجھے صابروں میں سے پائیں گے۔"

۶ ﴿ لَقَدۡ صَدَقَ اللّٰہُ رَسُوۡلَہُ الرُّءۡیَا بِالۡحَقِّ ۚ لَتَدۡخُلُنَّ الۡمَسۡجِدَ الۡحَرَامَ اِنۡ شَآءَ اللّٰہُ اٰمِنِیۡنَ ﴾ [الفتح: ۲۷]

"فی الواقع اللہ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو سچا خواب دکھایا تھا جو ٹھیک ٹھیک حق کے مطابق تھا۔ ان شاء اللہ تم ضرور مسجدِ حرام میں پورے امن کے ساتھ داخل ہو گے۔"

قواعد (گرامر) کی رو سے یہ جملہ ایک حرفِ شرط، ایک فعل اور ایک

فاعل پر مشتمل ہے، یعنی: إنْ. شَاء. اللّٰهُ

"إِنْ" حرفِ شرط ہے اور اس کا اپنا الگ وجود ہے۔ "شَاء" فعل ماضی ہے اور "اَللّٰهُ" فاعل ہے۔ چونکہ "إِنْ" اور "شَاءَ" میں سے ایک حرف اور دوسرا فعل ہے، لہٰذا ان کو ملایا نہیں جا سکتا، کیوں کہ ان کا الگ الگ وجود ہے۔ اسی بنا پر ان کا ایک دوسرے کے ساتھ اتصال نہیں ہو سکتا، یعنی "إِنْ شَاءَ" کو "إِنْشَاءَ" نہیں لکھا جا سکتا۔ ہاں! لفظ "إِنْشَاء" بھی عربی زبان میں موجود ہے اور اردو میں بھی بکثرت استعمال ہوتا ہے، لیکن اس کے معنی کچھ اور ہیں اور اس لفظ کو یہاں استعمال کرنے سے جملے کا مفہوم یکسر بدل جاتا ہے۔

"إِنْشَاء" مصدر ہے۔ اس کے معنی کسی چیز کی ابتدا کرنا، کسی چیز کی ابتدا ہونا اور کسی چیز کو نئے سرے سے وجود میں لانا، یعنی ایجاد و دریافت کرنا ہیں۔ قرآن مجید میں یہ لفظ ایک بار اور اس کے افعال قریباً 28 بار آئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے لیے اس کا استعمال یوں ہوا ہے:

﴿ اِنَّاۤ اَنۡشَاۡنٰہُنَّ اِنۡشَآءً ﴿۳۵﴾ فَجَعَلۡنٰہُنَّ اَبۡکَارًا ﴾ [الواقعة: ۳۵، ۳۶]

"ان کی بیویوں کو ہم خاص طور پر نئے سرے سے پیدا کریں گے اور انھیں پاکیزہ بنا دیں گے۔"

"إِنْشَاء" کا استعمال نثر و نظم کی صورت میں کوئی چیز لکھنا یا کہنا بھی ہوتا ہے۔ اسی مفہوم میں شعراء و ادباء کو فارسی میں انشا پرداز کہا جاتا ہے۔ مشہور عربی ڈکشنری "المعجم الوسیط" میں ادباء کے نزدیک "إِنْشَاء" کی درج ذیل تعریف کی گئی ہے:

"فَنٌّ يُعْلَمُ بِهِ جَمْعُ الْمَعَانِي وَالتَّأْلِيفُ بَيْنَهَا وَتَنْسِيقُهَا ثُمَّ التَّعْبِيرُ عَنْهَا بِعِبَارَاتٍ أَدَبِيَّةٍ بَلِيغَةٍ"

"یہ ایک ایسا فن ہے جس کے ذریعے معانی و مطالب کو جمع کرنے، انھیں باہم جوڑنے اور ایک لڑی میں پرونے کا کام کیا جاتا ہے، پھر ان کے ذریعے موثر ادبی عبارات میں مدعا بیان کیا جاتا ہے۔"

بچے کی تربیت اور پرورش کے لیے بھی یہ لفظ استعمال کیا جاتا ہے، جیسے کہا جاتا ہے: "وَ أَنْشَأَ الصَّبِيَّ" "اس نے بچے کی اچھی تربیت اور پرورش کی ہے۔"

اوپر کی معلومات سے نتیجہ نکلا کہ "إِنْ شَاءَ" کو "إِنْشَاءَ" لکھنا غلط ہے، لہٰذا اس کی املا "إِنْ شَاءَ" ہونا چاہیے۔

رقص وسرور۔ رقص وسرود:

جب سے ہمارے نصاب سے فارسی خارج ہوئی ہے، ہماری اردو زبان کو بہت نقصان پہنچا ہے۔ قیامِ پاکستان کے ساتھ ہی یہ سلسلہ سکولوں سے ختم کر دیا گیا۔ اگرچہ اگلی کلاسوں میں فارسی کو اختیاری مضمون کی حیثیت دے دی گئی، لیکن فارسی سے ناواقفیت کے باعث اردو کے بعض محاورے اور روز مرہ کے مرکبات غلط استعمال ہونے لگے ہیں۔

رقص وسرود (ناچ اور گانا) اصل ترکیب جو اردو میں عام مستعمل تھی، اب بعض ناواقف (بعض واقف بھی) لوگوں نے اس کو "رقص وسرور" لکھنا شروع کر دیا ہے۔ سرور کا مطلب لطف، فرحت وغیرہ ہے، اس کا تعلق رقص سے نہیں، گو لوگ رقص سے بھی لطف لیتے ہیں۔ اس صورت میں سرورِ رقص (رقص کا لطف) کہا جائے گا، رقص وسرور (ناچ اور لطف) نہیں کہا جائے گا۔ اردو عبارت میں یوں بھی درست ہوگا: "فلاں جگہ رقص دیکھ کر بہت سرور آیا۔" لیکن ناچ گانے کے لیے "رقص وسرود" ہی استعمال ہوگا۔

شروع دن سے ہی:

شروع کا لفظ ان دنوں غلط طور پر استعمال ہونے لگا ہے، خصوصاً دن کے ساتھ اس کا استعمال پہلے دن کے معنوں میں ہوتا ہے اور یہ غلط ہے۔ "پہلے دن

ہی سے'' استعمال ہوگا، مثلاً: ''بھارت نے پہلے دن ہی سے پاکستان کے خلاف سازشیں شروع کر دی تھیں۔''

مہنگا ترین:

اردو ہندی الفاظ کو فارسی عربی الفاظ سے مرکب کرنا اصولاً غلط ہے، لہٰذا مہنگا ترین کی ترکیب بھی غلط ہے۔ اس کی ترکیب ''گراں ترین'' ہوگی یا اردو میں ''سب سے مہنگا'' یا ''بے حد مہنگا'' یا ''بہت ہی مہنگا'' لکھنا مناسب ہوگا۔ ''ترین'' کا غلط استعمال دوسری عبارتوں میں بھی ہوتا ہے، جیسے: ''ظالم شخص نے غریب آدمی کو انتہائی سخت ترین سزائیں دیں۔'' یہاں ''انتہائی سخت'' لکھنے سے ''ترین'' کی ضرورت نہیں رہتی۔ ترین کے ہوتے ہوئے انتہائی کا لفظ لکھنا غلط ہے، لہٰذا انتہائی سخت یا سخت ترین لکھنا چاہیے۔

شروع ہونا۔شروع کرنا:

ایک عبارت ہے: ''اب مہاجر واپس جانا شروع ہو گئے ہیں۔'' یہ جملہ درست نہیں۔ اسے یوں لکھنا چاہیے: ''اب مہاجروں نے واپس جانا شروع کر دیا ہے۔'' ایسے ہی ''بچے نے رونا شروع کر دیا ہے۔'' درست ہوگا۔ ''بچہ رونا شروع ہوگیا۔'' غلط ہے۔ شروع ہونا آدمیوں کے ساتھ نہیں کسی کام کے ساتھ استعمال ہوگا، مثلاً: ''کارخانہ بننا شروع ہوگیا ہے۔''، ''سکول تعمیر ہو چکا ہے، اب اس میں تعلیم بھی شروع ہو جائے گی'' وغیرہ۔

تَشَیُّع: شیعہ ہونا:

اہلِ سنت کے مقابلے میں اکثر ''اہلِ تشیع'' کی ترکیب استعمال ہوتی

ہے۔ لفظ تشیع کا درست تلفظ ت پر زبر، ش پر زبر، ی پر شد اور پیش، عین ساکن، یعنی ''تَشَیُّع'' ہے۔ اکثر پڑھے لکھے لوگ بلکہ بعض فاضل اشخاص کی زبان سے ''تشِیع'' سنا ہے، یعنی س کے نیچے زیر، ی ساکن اور ع بھی ساکن۔ یہ تلفظ بروزن ''صریح''، ''صحِیح'' وغیرہ سراسر غلط ہے۔

آواز دینا۔آواز مارنا:

پنجابی میں آواز ''دینا'' کو عموماً آواز ''مارنا'' بولا جاتا ہے۔ یہ پنجابی کا مزاج ہے کہ آواز کے ساتھ مارنا ہی بولتے ہیں، یہاں تک کہ ایک گویے کی پنجابی نظم میں بھی اس کی گونج سنائی دیتی ہے: ''واجاں ماریاں ....'' لیکن اردو میں ''آواز دینا'' کہا جاتا ہے، اس لیے لکھنے میں بھی اس کی احتیاط ضروری ہے۔ آواز مارنا غلط ہے۔

چند الفاظ کی صحت

محمد اسحاق بھٹی رحمہ اللہ

برادرِ مکرم علیم ناصری نے ''الاعتصام'' کی چند گزشتہ اشاعتوں میں بعض ایسے الفاظ کی نشاندہی کی ہے، جو اردو اخباروں اور کتابوں کے ذریعے سے ہمیشہ ہمارے مطالعے میں آتے رہتے ہیں، لیکن ہم ان کی صحت کا خیال نہیں رکھتے۔ میں بھی اس ضمن میں چند باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں۔ ملاحظہ فرمایئے:

جمع الجمع:

① ہمارے ہاں بعض الفاظ جمع الجمع کی صورت میں استعمال کیے جاتے ہیں، مثلاً: لازم کی جمع لوازم ہے، لیکن کچھ لوگ اسے جمع الجمع بنا کر ''لوازمات'' تحریر فرماتے ہیں۔ حکم کی جمع احکام ہے، اسے احکامات بنا دیا جاتا ہے۔ لاحق کی جمع لواحق ہے، اسے لواحقین کی شکل دے دی جاتی ہے۔ رسم کی جمع رسوم ہے، اسے رسومات تک پھیلا دیا جاتا ہے۔

رکن کی جمع ارکان اور اکبر کی اکابر ہے۔ لیکن بعض دوستوں کو اس جمع پر صبر نہیں آتا اور اس وقت تک ان کی تسلی نہیں ہوتی جب تک انھیں جمع الجمع بنا کر اراکین اور اکابرین کے ثقیل الفاظ میں منتقل نہ کر دیں۔ پھر لفظ ''عمید'' کی عمائد اچھی بھلی اور ٹھیک ٹھاک جمع ہے، جو اپنے فرائضِ منصبی پوری طرح ادا کرتی ہے،

اسے خواہ مخواہ کھینچ کر عمائدین کے بھاری بھرکم سانچے میں ڈھال دیا جاتا ہے۔

جمع الجمع کا یہ سلسلہ نہ فصاحت سے میل کھاتا ہے اور نہ قوتِ سماعت آسانی سے اس بوجھ کو برداشت کرنے پر آمادہ ہوتی ہے۔ معلوم نہیں کیوں جمع پر اکتفا نہیں کیا جاتا اور کیوں اس سے آگے بڑھ کر فصاحتِ الفاظ کا حلیہ بگاڑنا ضروری سمجھا جاتا ہے۔

درستگی۔ کارکردگی:

② بہت سے لوگ درستگی، ناراضگی، حیرانگی، محتاجگی وغیرہ الفاظ بڑی فراخ دلی سے استعمال کرنے کے عادی ہیں، حالانکہ یہ بالکل غلط ہیں۔ اردو میں درستی، ناراضی، حیرانی، محتاجی وغیرہ لکھنا اور کہنا چاہیے۔

کوئی چیز کسی کے سپرد کی جائے تو کہا جاتا ہے کہ اس چیز کی سپردگی مکمل ہوگئی۔ یہ بھی غلط ہے۔ فلاں چیز اس کے سپرد کر دی گئی، کہنا چاہیے۔

کسی کو ملازم رکھا جائے تو بالعموم کہا جاتا ہے کہ آیندہ اس کی ''کارکردگی'' کے مطابق اس کی تنزلی یا ترقی کا فیصلہ کیا جائے گا۔ ''کارکردگی'' کا لفظ معیارِ صحت سے ہم آہنگ نہیں، اسے کارگزاری ہونا چاہیے۔

یہاں گرائمر کا یہ قاعدہ یاد رکھنا چاہیے کہ کیفیت بیان کرنے کے لیے ''گی'' اس وقت لایا جائے گا، جب لفظ کے آگے حرف ''ہ'' آئے، مثلاً: شائستہ، عمدہ، سنجیدہ، نمایندہ، کمینہ، فریفتہ، درندہ، درخشندہ وغیرہ۔ ان الفاظ کی نسبت کے لیے شائستگی، عمدگی، سنجیدگی، نمایندگی، کمینگی، فریفتگی، درندگی، درخشندگی لکھا اور بولا جائے گا۔ جن الفاظ کے آگے حرف ''ہ'' نہیں آتا، ان

کے آگے ''گی'' نہیں آئے گا، یعنی درست، حیران، ناراض وغیرہ کے آگے ''گی'' نہیں لائیں گے۔

③ بعض اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگ وفات کو ''فوتیدگی'' یا ''فوتگی'' لکھتے ہیں۔ یہ کسی زبان کے لفظ نہیں ہیں، ان کے بجائے وفات لکھنا چاہیے۔ یہ تھانے، تحصیل، کچہری اور میونسپل کمیٹیوں کے الفاظ ہیں، علم و ادب کی حدود میں ان کا داخلہ قطعی ممنوع ہے۔

مشہور ہے کہ مولانا ظفر علی خاں کے زمانے میں کسی کی موت کی اطلاع کے سلسلے میں ان کے اخبار ''زمین دار'' میں ''فوتیدگی'' کا لفظ چھپ گیا۔ صبح کو مولانا کی نظر سے یہ لفظ گزرا تو رات کے عملے کو طلب کر لیا گیا اور سخت ناراضی کا اظہار کیا۔ پتا چلا کہ جس نیوز ایڈیٹر نے یہ خبر لگائی ہے، وہ ان کا بھانجا ہے۔ فوراً اسے ملازمت سے علاحدہ کر دیا اور فرمایا: میری زندگی میں میرے اخبار میں یہ غلط لفظ نہیں چھپ سکتا۔

لیکن اب ہم دیکھتے ہیں کہ اخبارات و جرائد میں بے شمار غلط الفاظ چھپتے ہیں، کوئی کسی سے پوچھنے والا نہیں۔ لاہور کے ایک بہت بڑے اخبار کے مشہور کالم نویس نے اپنے کالم میں کئی مرتبہ یہ لکھا ہے کہ وہ فلاں موقع پر فلاں جگہ ایک ''فوتیدگی'' میں گئے۔

اب نہ کسی اخبار کے ارکانِ عملہ کو صحتِ الفاظ کا خیال ہے نہ مالکوں کو اس کا شعور! برسوں سے یہ کاروباری سلسلہ ہو گیا ہے اور اخبارات میں اشاعت بڑھانے کی دوڑ لگی ہوئی ہے۔

④ مکتبِ فکر کی ترکیب سکول آف تھاٹ یا دبستانِ فکر کے معنوں میں استعمال ہوتی ہے۔ بعض لوگ اسے ''مکتبۂ فکر'' لکھتے ہیں جو غلط ہے۔ پھر بعض دوست مکتب کی جمع مکاتیب بنا لیتے ہیں اور بصورت جمع ''مکاتیبِ فکر'' استعمال فرماتے ہیں۔ یہ بھی صحیح نہیں، مکاتبِ فکر لکھنا چاہیے۔ مکاتیب، مکتوب کی جمع ہے، مکتب کی نہیں۔ مکتب کی جمع مکاتب ہے۔ مکتوب، مکتب، مکتبہ، تینوں الگ الگ لفظ ہیں اور الگ معنی دیتے ہیں۔

مکتوب کے معنی ہیں: چٹھی، خط، مراسلہ۔ اس کی جمع مکاتیب بھی آتی ہے اور مکتوبات بھی۔ جمع کی صورت میں اس کے معنی ہوں گے چٹھیاں، خطوط، مراسلے۔

مکتب کے معنی ہیں: مدرسہ، سکول، پڑھنے کی جگہ، دبستان۔ اس کی جمع ہے مکاتب۔

مکتبہ کہتے ہیں کتب خانے اور لائبریری کو۔ اس کی جمع بھی مکاتب ہے (اور مکتبات بھی)۔

⑤ مَوْقِف: اس کے لفظی معنی ہیں ''کھڑے ہونے کی جگہ۔'' یہ نقطۂ نظر سے کنایہ ہے۔ کہا جاتا ہے: فلاں مسئلے میں میرا مَوْقِف یہ ہے۔ میم پر زبر، واوٗ ساکن اور قاف کے نیچے زیر۔ بعض اہلِ قلم واوٗ پر ہمزہ اور قاف پر شد ڈال کر اسے ''مؤقّف'' بنا دیتے ہیں، جو غلط ہے۔

⑥ نقطۂ نظر: اسے نقطۂ نگاہ بھی کہا جاتا ہے۔ یہ انگریزی لفظ ''پوائنٹ آف ویو'' کا ترجمہ ہے۔ اس کے معنی ہیں اندازِ فکر، مرکزِ نگاہ۔ اسے نکتہ نظر کہنا صحیح نہیں۔

⑦ نکتہ: اس کے معنی ہیں: پتے کی بات، باریک بات، گہری بات، تہہ کی بات، لطیفہ، بھید۔ اسی میں نکتہ بین، نکتہ چین، نکتہ پرداز، نکتہ پرور وغیرہ

ترکیبیں بنی ہیں۔ ''قائدِ اعظم کے چودہ نکات'' مشہور ہیں۔ لفظ نکتہ کی جمع ''نِکات'' آتی ہے۔ نون کے نیچے زیر کے ساتھ۔ بعض لوگ ''نُکات'' بولتے ہیں، یعنی نون پر پیش ڈال دیتے ہیں، یہ غلط ہے۔

⑧ چاق چوبند: اس کے معنی ہیں توانا، تندرست، چست، پھرتیلا۔ بعض دوست اس میں واؤ عطف لگا کر چاق و چوبند بولتے اور لکھتے ہیں، جو غلط ہے۔ شوقؔ کا شعر ہے[1] ؎

چاق چوبند سینہ زوری میں
پھول رکھے ہوئے کٹوری میں

بعض ستم ظریف اسے ''چاک و چوبند'' بنا دیتے ہیں جو یکسر غلط ہے۔

⑨ چیخ پکار: ہندی ترکیب ہے، اس کے معنی ہیں شور وفریاد جو کسی قسم کے خوف یا تکلیف کی وجہ سے زبان سے نکلے۔ زور کی آواز، غل، شور۔ بعض لوگ واؤ عطف لگا کر چیخ و پکار لکھتے ہیں، جو بالکل غلط ہے۔

⑩ برا ماننا: بعض لوگ برا منانا لکھتے ہیں، جو غلط ہے، صحیح برا ماننا ہے۔ ''وہ برا مان گئے''، صحیح جملہ ہے: ''انھوں نے برا منایا'' یہ غلط ہے۔[2]

---

[1] ترکی زبان میں ''چاق'' کے معنی ہیں چست، لہٰذا ''چاق چوبند'' کے معنی ہوئے جس کے چاروں بند یعنی ہاتھ پاؤں توانا یا چست ہوں۔ (فارانی)

[2] مثلاً کسی شاعر کا شعر ہے ؎

جو لوگ دل کی آگ کو پہچانتے نہیں
ہم ان کے تبصروں کو برا مانتے نہیں

یا.... آئینہ ان کو دکھایا تو برا مان گئے۔ (نعیم الحق نعیم)

⑪ تجربہ: جانچ، امتحان، آزمائش، ثبوت، دلیل، دلالت، وہ انسانی معلومات جو قوتِ حافظہ اور قیاس کے باہم ملنے سے پیدا ہوتی ہیں۔ مشاہدہ اسی کا حصہ ہے۔ بعض لوگ اس کا تلفظ ''تجرُبہ'' کرتے ہیں جو غلط ہے۔ صحیح لفظ ''تجربہ'' ہے۔ باب تفعیل کا مصدر: جَرَّبَ، یُجَرِّبُ، تَجْرِبَةً.

⑫ تَرْبِیَتْ: پالنا، پرورش کرنا، حسنِ اخلاق کی تعلیم دینا، تہذیب سکھانا، ادب سکھانا، مودب بنانا۔ ''رَبّٰی، یُرَبِّیْ، تَرْبِیَةً''، علم صرف کی بولی میں یہ لفظ بابِ تفعیل (ناقص واوی) کا مصدر ہے۔ بعض لوگ ''ی'' پر شد ڈال کر ''تربیّت'' بنا دیتے ہیں جو صحیح نہیں، صحیح لفظ ''تَرْبِیَتْ'' ہے۔ پہلی ت پر زبر، ب کے نیچے زیر، ی پر زبر، دوسری ت پر جزم۔ پورے لفظ میں شد کا کہیں نام ونشان نہیں ہے۔

⑬ مُتَّحِدَہ: اکٹھا، اتحاد کیا گیا، متفق، ایک دوسرے میں شامل، باہم ملے ہوئے، پیوستہ، ''اِتَّحَدَ، یَتَّحِدُ، اِتِّحَادًا فھو مُتَّحِدٌ''، علم صرف کی رو سے یہ لفظ مثال واوی کا اسم فاعل ہے۔ میم پر پیش، ت پر شد اور زبر۔ بعض لوگ ''مُتْحِدَّہ'' بولتے ہیں، یعنی م پر پیش، ت پر جزم اور دال پر شد، یہ بالکل غلط ہے۔ دونوں کے معنوں میں بھی بہت فرق ہے۔

ٹیلی ویژن کی خبریں سنانے والے اکثر افراد جب ''اقوامِ متحدہ'' کو ''مُتْحِدَّہ'' کہتے ہیں تو اس محکمے کی معلومات کا ماتم کرنے کو جی چاہتا ہے۔

⑭ معنی: یہ عربی لفظ ہے جو مطلب، منشا، مراد، علم، سبب، وجہ، باعث، خوبی کے مفہوم کو واضح کرتا ہے۔ کسی شاعر نے کہا ہے ؎

آئینہ خانے میں وہ چھپے اپنے حسن سے
خوبی یہ حسن کی ہے یہ معنی حیا کے ہیں

معنی بصورت واحد نہیں بلکہ بصورت جمع ہوتا ہے، یعنی یہ نہیں کہا جائے گا کہ ''اس کا معنی یہ ہے۔'' بلکہ ''اس کے معنی یہ ہیں۔'' کہا جائے گا۔ شعر سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے۔ شعر کے ان الفاظ پر غور فرمائیے: ''یہ معنی حیا کے ہیں۔''

(۱۵) مُتَّفقہ: میم پر پیش، ت پر شد اور زبر، ف پر زیر یا زبر۔ دو ڈھائی سال پہلے کی بات ہے۔ ایک دن ٹیلی ویژن پر ایک معروف روز نامے کے چیف ایڈیٹر جو خیر سے اس کے مالک بھی ہیں، اتحاد و اتفاق اور قومی یک جہتی کے موضوع سے متعلق تقریر فرما رہے تھے۔ ارشاد ہوا: ''قومی معاملات میں ہمیں مُتفقہ قدم اٹھانا چاہیے۔'' اخبار کے مالک اور چیف ایڈیٹر صاحب نے میم پر پیش ڈالا، ت کو ساکن اور قاف کو مشدد کیا، جو قطعی طور پر غلط ہے۔ یہ ہے قابلیت آج کل کے بعض ایڈیٹروں اور اخبار نویسوں کی!

یہ لفظ مُتَّفِقہ ہے اور اسم صفت ہے۔ اس کے معنی ہیں: اتحاد و اتفاق والا، ایک رائے یا ایک ہی نقطۂ نظر والا۔

(۱۶) خُرد: فارسی لفظ ہے۔ ''خ'' پر پیش اور ''ر'' ساکن۔ اس کے معنی ہیں: چھوٹا، کم عمر۔ یہ کلاں کے برعکس استعمال ہوتا ہے۔ اسے عام طور پر واؤ کے ساتھ ''خورد'' لکھا جاتا ہے جو صحیح نہیں ہے۔ شیخ سعدی کا شعر ہے ؎

بیاموز رفتار از طفلِ خُرد
کہ چوں استعانت بدیوار برد

(۱۷) خِرَد: یہ بھی فارسی لفظ ہے۔ ''خ'' مکسور، ''ر'' مفتوح اور دال مجزوم۔ یہ مؤنث استعمال ہوتا ہے، اس کے معنی ہیں: عقل، دانائی، دانش۔

(۱۸) دُکّان: عربی لفظ ہے۔ دال پر پیش اور کاف پر شد۔ سودا بیچنے اور خریدنے کی جگہ۔ جمع دکانیں۔ اسے واؤ کے ساتھ ''دوکان'' املا کرنا غلط ہے۔ فارسی میں بغیر تشدید کاف بھی آتا ہے۔ ناسخ کا شعر بطور دلیل ملاحظہ ہو:

بند ہو جائے درِ توبہ تو زاہد غم نہیں
ہو قیامت، بند گر دیکھوں دکاں خمار کی

(۱۹) مُوَحِّد: توحید کا اقرار کرنے والا، خدا کو ایک ماننے والا۔ اہلِ حدیث حضرات اپنے آپ کو موحد کہلاتے ہیں، لیکن پچھلے دنوں جماعت اہلِ حدیث ہی کے ایک اخبار میں اس لفظ کو ''مواحد'' (واؤ کے آگے الف) کے املا کے ساتھ پڑھنے کا انتہائی افسوس ناک حادثہ پیش آیا۔ یا تو یہ سنگین غلطی پروف ریڈر کی تھی یا مضمون نگار کی۔ جس مضمون نگار کو یہ معلوم نہیں کہ لفظ مواحد ہے یا موحد، اس کا مضمون ہرگز نہیں چھاپنا چاہیے۔ پھاڑ کر ردی کی ٹوکری میں پھینک دینا چاہیے اور آئندہ اس کا کوئی مضمون شائع نہیں کرنا چاہیے، اگرچہ کسی موضوع پر ہو۔

(۲۰) مَدْعُوّ: عربی لفظ ہے اور اردو میں کثرت سے استعمال ہوتا ہے، میم پر زبر، دال پر جزم، عین پر پیش اور واؤ مشدد۔ جسے انگریزی میں انوائٹڈ (Invited) کہا جاتا ہے۔ بعض لوگ اسے مَدْعُو بولتے ہیں، یعنی میم پر زبر، دال پر جزم، عین پر پیش اور واؤ ساکن۔ یہ تلفظ بالکل غلط ہے۔

(۲۱) عَدُوّ: عربی لفظ ہے اور اردو میں مستعمل ہے، عین پر زبر، دال پر پیش اور واوٗ مشدد۔ اس کے معنی ہیں: دشمن، حریف، رقیب، مخالف۔ بعض دوست اس کا عَدُوْ تلفظ کرتے ہیں جو غلط ہے۔[1]

(۲۲) تَفَاعُلْ: کے وزن پر عربی کے بہت سے الفاظ، جو اردو میں مستعمل ہیں، ہم روزانہ کتابوں اور اخباروں میں پڑھتے ہیں، مثلاً: تَعَارُفْ، تَعَاوُنْ، تَصَادُمْ، تَنَاوُلْ، تَجَاوُزْ، تَغَافُل، تَجَاهُل، تَوَاضُعْ وغیرہ۔ یہ لفظ پانچ حروف پر محیط ہے۔ ان کا پہلا حرف ت ہے جس پر زبر ہے، آخری سے پہلا یعنی چوتھا حرفِ مضموم ہو گا۔ لیکن بعض پڑھے لکھے اور کتابوں کے مصنف حضرات پہلے حرف (ت) کو مضموم کر کے اور چوتھے حرف پر زبر لگا کر، صاف انداز میں تا کہ کسی کو سمجھنے میں دقت پیش نہ آئے، تُعَاوَنْ، تُعَارَفْ، تُجَاوَزْ، تُصَادَمْ تلفظ فرماتے ہیں، جو قطعاً غلط ہے۔

(۲۳) اسی طرح "تَفَعُّلْ" کے وزن پر عربی کے متعدد الفاظ اردو میں استعمال ہوتے ہیں، مثلاً: تَعَلُّقْ، تَكَلُّفْ، تَصَرُّفْ، تَمَدُّنْ، تَصَنُّعْ، توجُّہْ، تَشَيُّع وغیرہ۔ یہ الفاظ چار چار حروف پر مشتمل ہیں۔ ان کا پہلا حرف ت ہے، جس پر زبر ہے، تیسرا مضموم اور چوتھا ساکن ہے، لیکن اسے بھی ہم نے بعض تعلیم یافتہ احباب کی زبان سے سنا کہ پہلے حرف (ت) کو مضموم کر کے اور تیسرے پر زبر لگا کر پوری وضاحت اور نہایت صراحت کے ساتھ،

[1] یہ موقف درست نہیں کہ مَدعُو اور عَدُو کو اصل عربی تلفظ کی پیروی میں واوٗ مشدد کے ساتھ بولا اور لکھا جائے۔ اساتذہ کے فارسی، اردو اشعار میں عَدُو واوٗ مشدد کے بغیر استعمال ہوا ہے....

عدو سے شرے برانگیزد کہ خیرِ ما دراں باشد (فارانی)

جیسے کسی کو سکھانا اور پڑھانا اور اس کا تلفظ درست کرانا مقصود ہو، تُكَلَّفْ، تُعَلَّقْ، تُمَدَّنْ، تُصَرَّفْ، تُمَرَّدْ، تُوَجَّہْ، تُصَنَّعْ ارشاد فرماتے ہیں۔

"تَعَاوُنْ" اور "تَعَارُفْ" کے ہم وزن الفاظ کی ت کو مضموم کرنا اور چوتھے حرف پر زبر لگانا، نیز "تَعَلُّقْ" کے ہم وزن الفاظ کے پہلے حرف (ت) کو مضموم بنانا اور تیسرے حرف پر زبر مسلط کر دینا انتہائی مذموم اسلوبِ کلام اور اردو زبان کے ساتھ زبردستی کا مظاہرہ کرنا ہے۔

(۲۴) اِمالہ: اردو تحریر و نگارش میں جن امور کا خیال رکھنا چاہیے، ان میں امالہ بھی شامل ہے۔ امالے کا مطلب ہے اردو کے کسی لفظ کے آخر میں الف یا "ہا" آئے تو اسے "ے" میں بدل دینا۔ مثال کے طور پر لفظ "سلسلہ" اثنائے کلام میں آئے تو اس کے آخر کے حرف "ہا" کو "ے" سے بدل دیجیے۔ "میں خرید و فروخت کے سلسلے میں بازار گیا۔" یہاں لفظِ "سلسلہ" استعمال نہ فرمائیے، "سلسلے" بولیے اور لکھیے۔

اسی طرح لفظ "مسئلہ" ہے۔ "اس مسئلہ کے متعلق اس کی رائے یہ ہے۔" کے بجائے "اس مسئلے کے متعلق اس کی رائے یہ ہے۔" کہیے۔

"اس بارہ میں ہم نے ان سے بات کی۔" یہاں "اس بارے میں" کہا جائے۔ "میں اوکاڑا گیا" کو "میں اوکاڑے گیا۔" کہنا چاہیے۔

جو اہلِ زبان اور اردو ادب و انشا سے تعلق رکھنے والے حضرات لکھنے میں امالہ نہیں کرتے، مثلاً: سلسلہ میں، مسئلہ میں، بارہ میں لکھتے ہیں، وہ بولنے میں لازماً امالہ کرتے ہیں، لیکن ہم نے بعض معروف مقرروں اور واعظوں کو سنا ہے

کہ وعظ وتقریر میں وہ صاف الفاظ میں علی الاعلان یعنی ''وج گج'' کے ''سلسلہ میں''، ''مسلہ میں''، ''بارہ میں'' وغیرہ بولتے ہیں، کسی لفظ کا امالہ نہیں کرتے۔ یہ غلط تو نہیں، لیکن فصاحت کے منافی ہے اور ذوقِ صحیح پر گراں گزرتا ہے۔ اس قسم کے الفاظ کا تقریر وتحریر میں امالہ کیا جائے تو عبارت میں خوب صورتی پیدا ہو جاتی ہے۔[1]

[1] قرآن میں صرف ایک جگہ سورۃ ہود میں ﴿مَجْرٖىهَا﴾ کی ''را'' کا امالہ کرتے ہیں۔ (فارانی)

صحتِ الفاظ کا مسئلہ:

الفاظ کی صحت کا مسئلہ بہت اہم ہے، اس میں بڑے بڑے لوگ ٹھوکر کھا جاتے ہیں اور بعض غلط الفاظ کو صحیح سمجھنے پر مصر رہتے ہیں۔ مندرجہ ذیل سطور میں صرف تین لفظوں کی طرف قارئین کرام کی توجہ مبذول کرائی جاتی ہے۔ آئندہ ان شاء اللہ اس ضمن میں مزید عرض کیا جائے گا۔

اہلِ حدیث:

یہ ایک خاص فقہی مسلک (سلفی) کی حامل جماعت کا نام ہے۔ لفظ ''اہل'' کی اضافت حدیث کی طرف ہے اور یہ ترکیب (اہلِ حدیث) اسی طرح استعمال ہوگی۔ بعض حضرات لفظِ حدیث کو حدیثوں میں بدل دیتے ہیں اور عام طور پر کہا کرتے ہیں: ''اہلِ حدیثوں کا جلسہ ہو رہا ہے۔'' ''اہلِ حدیثوں نے یہ فیصلہ کیا ہے۔'' ''اہلِ حدیثو! یوں کرو۔'' یہ بالکل غلط تلفظ ہے۔

اہلِ حدیث ایک جماعت کا نام ہے۔ نام اس انداز کی جمع کا متحمل نہیں ہوتا اور نہ لفظ ''اہل'' کی اضافت اس اسلوب کے کسی اردو لفظ کی طرف کی جا سکتی ہے۔ خود لفظ ''اہل'' لغوی اعتبار سے بصورتِ جمع استعمال ہوتا ہے اور اس میں کثرت کے معنی پائے جاتے ہیں، مثلاً: ''اہلِ علم'' کا اطلاق اصحابِ علم یا

علماء کی جماعت پر ہو گا۔ ''اہلِ فن'' ایک پورے گروہ کو کہیں گے۔ ''اہلِ سنت'' کا اطلاق مسلمانوں کے ایک بہت بڑے فریق یا بہت بڑی جماعت پر ہو گا۔ ''اہلِ بیت'' کا منطوق اصطلاح میں نبیِ مکرم ﷺ کے خاص عزیز اور اصحابِ خانہ ہوں گے۔

''اہل اللہ'' تقویٰ شعار اور پاک باز لوگوں کو کہا جائے گا۔ ''اہلِ قلم'' مصنفین اور تحریر و نگارش کی خدمت انجام دینے والوں کو کہیں گے۔ ''اہلِ سیف'' فنِ سپاہ گری سے آگاہ اور شمشیر زن لوگ ہوں گے۔ ''اہلِ قرآن'' کی اصطلاح موجودہ دور میں ان لوگوں پر صادق آئے گی، جو انکارِ حدیث کے لیے آیاتِ قرآن کی من مانی تاویلیں کرتے ہیں۔ ''اہلِ کتاب'' سے مراد یہود و نصاریٰ ہیں۔

ان میں سے کسی ترکیب کی جمع بنا کر یہ نہیں کہا جائے گا کہ اہلِ علموں نے علم کی بڑی اشاعت کی۔ اہلِ قلموں نے بہت سی کتابیں لکھیں۔ اہلِ سیفوں نے خوب تلواریں چلائیں۔ اہلِ کتابوں نے منزل من اللہ کتابوں میں تحریف کی۔ اہلِ فنون نے اپنے فن کا جی بھر کر مظاہرہ کیا۔ اہلِ سنتوں نے فلاں مسئلہ یوں بیان کیا۔ اہلِ قرآنوں نے حدیث کی مخالفت کی وغیرہ۔ اس لیے کہ خود لفظِ ''اہل'' میں جمع اور کثرت کی خصوصیت موجود ہے۔

سوال یہ ہے کہ جب اہل کے بعد آنے والے ان الفاظ کی جمع نہیں ہو سکتی تو پھر لفظ ''اہلِ حدیث'' نے کیا گناہ کیا ہے کہ اسے اٹھا کر لغت اور گرائمر کے دائرے سے باہر پھینک دیا جائے؟ اگر ''اہلِ حدیثوں'' قسم کی بے ڈھنگی جمع کو خدانخواستہ صحیح قرار دے دیا جائے تو فرمایئے: ''اہل اللہ'' کی جمع کیا ہو گی؟!

واحد اور مفرد کے لیے ''اہل'' کا لفظ نہیں بولا جاتا، مثلاً: زبان و لغت کے اعتبار سے ''فلاں شخص اہلِ علم ہے۔'' کہنا قرینِ صحت نہیں، صاحب علم یا ذی علم کہنا چاہیے یا یوں کہا جائے کہ اس کا تعلق اہلِ علم کی ایک جماعت سے ہے۔
اہلِ فن کے بجائے فرد کو صاحبِ فن کہا جائے گا، اسی طرح صاحبِ قلم، صاحبِ شمشیر وغیرہ۔

مطلب یہ ہے کہ اہلِ حدیثوں کہنا قطعاً غلط ہے۔ میں نے کئی مرتبہ دوستوں سے عرض کی کہ یہ لفظ استعمال نہ فرمایا کریں، مگر معلوم ہوتا ہے کہ انھیں غلط لکھنے اور غلط بولنے سے پیار ہو گیا ہے۔ صحیح بات ماننے سے انھیں تکلیف ہوتی ہے!!

ایک مرتبہ دیواروں پر اشتہار چسپاں دیکھا، جس کا عنوان تھا: ''اہلِ حدیثو! ہوشیار ہو جاؤ۔'' پڑھ کر بڑی شرم آئی کہ اشتہار لکھنے والوں کو کچھ پتا نہیں کہ یہ لفظ صحیح ہے یا غلط!

اہلِ حدیثوں قسم کا لفظ جماعت اہلِ حدیث کے مرحوم اکابر میں سے کسی نے بھی استعمال نہیں کیا۔ ان کی تحریریں پڑھنے اور تقریریں سننے والے ابھی تک بے شمار لوگ موجود ہیں، وہ گواہی دیں گے کہ نہ ان کے قلم کبھی اس غیر ثقہ لفظ سے ملوث ہوئے اور نہ کبھی ان کی زبان اس سے آلودہ ہوئی۔

ملک ابو یحییٰ امام خاں نوشہروی مرحوم طرحدار مصنف تھے اور الفاظ کا وسیع ذخیرہ ان کے ذہن میں محفوظ تھا جسے وہ کامل توجہ اور پوری صحت کے ساتھ استعمال میں لاتے تھے۔ ایک دفعہ اپنی ایک چھوٹی سی تازہ تصنیف دکھائی، جس کا

نام تھا: ''اہلِ حدیثوں کے دس مسائل'' اس وقت مولانا محمد حنیف ندوی مرحوم اور ان سطور کا راقم شام کے بعد انار کلی میں حاجی محمد اسحاق حنیف مرحوم کی دکان پر بیٹھے تھے۔ کتاب کا نام دیکھ کر مولانا ندوی مرحوم نے میری طرف اور میں نے ان کی طرف دیکھا تو ملک صاحب فوراً معاملے کی تہ تک پہنچ گئے۔ بولے: سخت غلطی ہوگئی ہے، لیکن اب کیا کیا جائے؟ کتاب اچھی خاصی تعداد میں لوگوں کے پاس پہنچ چکی ہے۔ پھر کچھ عرصے کے بعد اس کا ٹائٹل ''اہلِ حدیث کے دس مسائل'' کی شکل اختیار کر گیا۔

② وفیات: یہ عربی لفظ ہے اور وفات کی جمع ہے۔ اس کے معنی ہیں: موت، دنیا سے رخصت ہو جانا۔ واؤ پر زبر، ف پر زبر اور ی پر زبر۔ بعض دوست اسے ''وَفِیّات'' پڑھتے اور بولتے ہیں۔ یعنی واؤ پر زبر لگا کر ف کو مشدد کیا اور اس کے نیچے زیر ڈال دی، پھر نہایت بے رحمی سے ''ی'' پر شد لاد دی گئی۔ یہ بالکل غلط ہے اور اس لفظ کے لیے تکلیف مالا یطاق ہے، یعنی اسے ایسی مشقت میں مبتلا کرنا ہے جو اس کی برداشت سے باہر ہے۔ اس تلفظ کا عربی میں کوئی لفظ نہیں ہے۔ ''وَفَیَاتُ الْأَعْیَان'' ایک کتاب بھی ہے، جو کئی جلدوں پر مشتمل ہے اور ابن خلّکان کی تصنیف ہے۔ جیسا کہ کتاب کے نام سے ظاہر ہے، اس میں فوت شدہ اہم شخصیات کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

③ پروا: فارسی لفظ ہے، اس کے معنی ہیں: حاجت، رغبت، ضرورت، توجہ۔ جملے میں یہ لفظ اس طرح استعمال ہوگا: ''اسے میری کوئی پروا نہیں۔'' ''وہ

بے پروا شخص ہے۔'' بعض حضرات آخر میں ''ہ'' لگا کر ''پرواہ'' لکھتے ہیں، جو صحیح نہیں ہے۔ کسی کا شعر ہے

نہیں روزن جو قصرِ یار میں پروا نہیں ہم کو
نگاہِ شوق رخنہ کرتی ہے دیوارِ آہن میں

ایڈیٹر کی ڈاک:

صحتِ الفاظ

بخدمت گرامی محترم المقام جناب مولانا محمد اسحاق بھٹی صاحب زید مجدہ۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

اللہ تعالیٰ آپ کی صحت وسلامتی کے نگہبان رہیں۔ ہفت روزہ ”الاعتصام“ لاہور کے دو شماروں میں غلط تلفظ کی تصحیح کے باب میں آپ کے دو نہایت درجہ معلوماتی مضامین نظر افروز ہوئے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر سے نوازیں۔ آپ کی یہ سعی آج خود ہماری اپنی جماعت ہی کی ایک ناگزیر ضرورت ہے۔

ہماری جماعت کے علمی سٹیج پر آج کچھ ایسے اصحابِ ادعا نمایاں ہیں، جن کا حسنِ بیان علم کے بجائے بعض عوام پسند طریقوں سے قائم ہے اور وہ زبان و بیان کی بے حد و بے شمار غلطیوں سے جماعت کی علمی شہرت کے لیے بدنامی کا موجب ہیں۔ آپ کی یہ مہم ایسے علماء کی اصلاح کے لیے ایک نہایت درجہ حکیمانہ تدبیر کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس طرح وہ لوگ اپنی اَنا کو قائم رکھ کر بھی بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ اگرچہ یہ تھکا دینے والی مہم ہے، لیکن آپ بہر حال اس کے اہل ہیں۔ اگر آپ نے بسم اللہ کر ہی دی ہے تو اب یہ سلسلہ منقطع نہیں ہونا چاہیے۔

ایک لفظ عَدُوّ کے بارے میں البتہ ایک امر آپ کی توجہ کا محتاج ہے۔ اگر آپ بھی اس فقیر سے اتفاق کریں تو ریکارڈ کی درستی کے لیے اگلی فرصت میں

بات کا رخ سیدھی سمت کر چھوڑیں۔ آپ نے تحریر فرمایا ہے:

”عَدُوّ عربی لفظ ہے۔ اردو میں مستعمل ہے۔ عین پر زبر، دال پر پیش اور واؤ مشدد۔ بعض لوگ اس کو ”عَدُو“ تلفظ کرتے ہیں جو غلط ہے۔“ (”الاعتصام“ 7 اپریل 1995ء صفحہ: 21 کالم 2)

اس فقیر کے خیال میں یہاں کوئی بے دھیانی دخل پا گئی ہے، کیوں کہ اردو کے حوالے سے اس لفظ کو ”عَدُو“ تلفظ کرنا غلط نہیں ہے۔ ”عَدُوّ“ کا بہ تشدید واؤ تلفظ عربی زبان سے خاص ہے۔ عربی سے باہر اس لفظ کو واؤ مشدد کے ساتھ اختیار نہیں کیا گیا۔ فارسی زبان میں تو یہ لفظ بہ تشدید واؤ داخل ہی نہیں ہوا اور اردو اساتذۂ فن بھی اس کو گفتگو، جستجو اور آبرو وغیرہ ہی سے ہم قافیہ باندھتے ہیں۔ مرزا غالبؔ کا شعر ہے ؎

جس زخم کی ہو سکتی ہو تدبیر رفو کی
لکھ دیجیو یا رب اسے قسمت میں عدُو کی

غالب کی مشہور غزل جس کا مطلع ہے ؎

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے
تمھی کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے

اس غزل کا ایک شعر ہے ؎

یہ رشک ہے کہ وہ ہوتا ہے ہم سخن تم سے
وگرنہ خوف بد آموزیِ عدُو کیا ہے

ایک شعر مزید ؎

یہی ہے آزمانا تو ستانا کس کو کہتے ہیں؟
عدُو کے ہو لیے جب تم تو میرا امتحاں کیوں ہو

خود ہماری اپنی جماعت کے نغز گو شاعر اور آپ کے رفیقِ صحافت و شریکِ ادارت مولانا نعیم الحق نعیم صاحب کا ایک شعر ہے ؎

ذرا تم ہی بتاؤ رازداری اس کو کہتے ہیں؟
عدُو تک بات جا پہنچی جو خلوت میں کہی تم سے

والسلام

(مولانا حکیم) عبدالرحمان خلیق، بدوملہی

مزید توضیح:

راقم کا خیال ہے کہ لفظ "عدُو" اگرچہ عربی زبان میں واؤ کی تشدید کے ساتھ ہی مستعمل ہے، تاہم فارسی اور اردو وغیرہ میں دونوں طرح استعمال ہوتا ہے، چنانچہ اردو کی مستند لغت "نور اللغات" میں اس لفظ کو مشدد ضبط کرنے کے بعد لکھا ہے: "فارسی والوں نے اسے بغیر تشدید کے بھی استعمال کیا ہے۔"

خاص طور پر شعر و شاعری میں تقطیع کی خاطر متعدد نرمیاں اور سہولتیں ویسے ہی مروج اور مسلم ہیں۔ اس لیے جناب مولانا بھٹی صاحب کا واؤ کی تشدید کے بغیر "عدُو" کو اردو میں مطلقاً غلط قرار دینا اور اسی طرح محترم مولانا عبدالرحمان خلیق صاحب کا علی الاطلاق فرمانا: "فارسی زبان میں تو یہ لفظ بہ تشدید واؤ داخل ہی نہیں ہوا۔" ہمارے خیال میں محلِ نظر، بلکہ نظرِ ثانی کے قابل ہے۔ (نعیم الحق نعیم)

صحتِ الفاظ

محمد اسحاق بھٹی رحمہ اللہ

21 جولائی 1995ء کے "الاعتصام" میں مولانا عبدالرحمان خلیق کا مکتوبِ گرامی شائع ہوا ہے جو خوانندگانِ محترم کے علم میں آچکا ہے۔ نہایت مسرت ہوئی، صحتِ الفاظ سے متعلق ایک صاحبِ نظر بزرگ عالم نے اس فقیر کی گزارشات ملاحظہ فرمائیں اور اس سلسلے کو جاری رکھنے کا مشورہ دیا۔

لفظ "عدوٗ" کے بارے میں از راہِ کرم انھوں نے جو کچھ ارشاد فرمایا ہے، وہ بھی قارئینِ کرام کے علم میں آگیا۔ میرے ناقص خیال کے مطابق اس ضمن میں قاری نعیم الحق نعیم کی رائے کو "اعتدال کی راہ" قرار دینا چاہیے۔

ہمیں لکھنے لکھانے کی عادت پڑ گئی ہے یا غالب کی زبان میں یوں کہیے ؎

مگر ستم زدہ ہوں ذوقِ خامہ فرسا کا

ہر لکھنے والا یہ سمجھتا ہے کہ جوں ہی اس نے لوگوں کو کبھی غلط بات پر ٹوکا اور صحیح بات کی نشاندہی کی، فوراً لوگ غلط بات سے کنارہ کش ہو کر صحیح بات پر عمل کی دیواریں استوار کرنا شروع کر دیں گے۔ یہ محض خوش فہمی ہے۔ بے شک کتنا زور لگا کر لکھا جائے اور اپنی دانست میں کتنی صحیح بات کہی جائے، کوئی نہیں مانتا۔

میں نے بعض الفاظ کی صحت و عدمِ صحت کی طرف لکھنے والوں کو توجہ

دلائی، لیکن پورے اہتمام اور باقاعدگی کے ساتھ بہ دستور وہی الفاظ تحریر فرمائے جا رہے ہیں جنھیں اردو گرامر کی رو سے غلط قرار دیا گیا تھا اور غلط ہیں۔ بس نفسیاتی طور پر ایک خوش فہمی ہے جو لکھنے پر مجبور کرتی ہے اور خوش فہمی کا فائدہ یہ ہے کہ کوئی صحیح بات کہنے کا موقع مل جاتا ہے۔ اگر خوش فہمی نہ ہو تو حق گوئی کا جذبہ ہی سرے سے معدوم ہو جائے۔ ابلاغِ حق کے تسلسل کے لیے اسے اللہ کی نعمت سے تعبیر کرنا چاہیے تو آیئے اس خوش فہمی کی بنا پر آج کی صحبت میں چند مزید الفاظ پر غور کرتے ہیں جو اردو میں مستعمل ہیں:

① اَتَمّ: عربی کا لفظ ہے اور اسمِ تفضیل ہے۔ الف پر زبر، ت پر بھی زبر، میم پر شد۔ اس کے معنی ہیں: بالکل مکمل، بہت زیادہ مکمل۔ بعض لوگ اس کو ''اُتّمْ'' پڑھتے ہیں جو غلط ہے، یعنی الف پر ضمہ ڈالتے ہیں، ت پر زبر ڈال کر اسے مشدد کرتے ہیں اور میم کو ساکن کر دیتے ہیں۔

② اُتّمْ: یہ ایک بالکل علاحدہ لفظ ہے اور ہندی زبان کا لفظ ہے۔ اس کے معنی ہیں: بہتر، اچھا، عمدہ، اول درجے کا، اعلیٰ کوالٹی کا، شریف، پاک۔ یہ لفظ بطورِ صفت استعمال ہوتا ہے، مثلاً: ''فلاں شے اُتّمْ ہے۔'' یعنی بہتر اور اعلیٰ درجے کی ہے۔ ہندی کی بعض کہاوتوں میں بھی یہ لفظ آتا ہے، مثلاً: ''اُتّمْ کھیتی، مدھم بیوپار، نکھد چاکری، بھیک مدار۔''

یعنی سب سے اچھا کام کھیتی باڑی ہے، اس سے کم تجارت، گرا ہوا کام نوکری ہے اور سب سے ذلیل اور برا کام بھیک مانگنا ہے۔

بہرحال ''اَتَمّ'' عربی کا لفظ ہے اور ''اُتّمْ'' ہندی کا۔ یہ دو الگ الگ

لفظ ہیں اور دونوں کے معنوں میں بھی فرق ہے۔ تلفظ کرتے وقت اس کا خیال رکھنا چاہیے۔

③ اُجْڑَا: یہ بھی ہندی لفظ ہے۔ الف پر پیش اور ج ساکن۔ برباد، بے رونق، ویران، خراب شدہ، غارت شدہ، غیر آباد۔ اُجڑا پُجڑا: لٹا کھسا، تباہ و برباد ہوا۔ اگر یہ لفظ فعل لازم کے طور پر استعمال ہو، مثلاً: ''اجڑ جانا'' کہا جائے تو ''الف'' پر پیش، ''جیم'' پر زبر اور ''ڑ'' ساکن ہو گی۔ اُجَڑْنا بھی فعل لازم ہے، اس کا تلفظ بھی وہی ہوگا۔

اُجَڑْوانا فعل متعدی ہے، اس کے معنی ہیں کسی کو لٹوانا، برباد کرانا، ویران کرانا، نیست و نابود کرانا۔ یہاں بھی الف پر پیش، جیم پر زبر اور ڑ پر جزم ڈالیے۔

④ اَجَلْ: عربی لفظ ہے اور مؤنث استعمال ہوتا ہے۔ الف اور جیم پر زبر، لام ساکن۔ لغوی معنی ہیں: وقت، مہلت، مدت۔ اصطلاح میں موت، مرگ اور قضا پر بولا جاتا ہے۔

⑤ اَجَلّ: یہ بھی عربی لفظ اور اسمِ تفضیل ہے۔ الف اور جیم مفتوح، لام مشدد۔ اس کے معنی ہیں: بزرگ ترین، جلیل القدر۔

⑥ اُجَّلْ: املا کے لحاظ سے ان دونوں لفظوں سے ملتا جلتا لفظ ہے، لیکن ہندی زبان کا ہے۔ الف پر ضمہ اور جیم پر فتحہ ڈال کر اسے مشدد کریں اور لام پر جزم ڈالیں۔ اس کے معنی ہیں: سفید، برّاق، صاف، شفاف۔ اسی سے اُجلا، بصورت صفت استعمال ہوتا ہے۔

اُجَلُ بدھ: اجلی اور اچھی سمجھ کے آدمی کو کہا جاتا ہے۔

اُجَلُ بَرن: سفید پوش کے لیے بولا جاتا ہے۔ ہندی زبان کا ایک دوہا ہے:

اجل برن آدھین پن ایک چت دو دھیان
ہم تو جانت بڑے بھگت نکلے کپٹ کی کھان

اس دوہے میں بگلے کی فطرت بیان کی گئی ہے اور اس کا اطلاق منافق اور بدباطن شخص پر ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے: ''فلاں شخص بڑا بگلا بھگت ہے۔'' یعنی منافق اور دھوکا دینے والا ہے۔ دل میں کوئی اور بات ہوتی ہے اور زبان پر کوئی اور۔

نمبر 6,5,4 لکھنے میں ایک جیسے الفاظ ہیں، لیکن تلفظ تینوں کا مختلف ہے، معنی بھی الگ الگ ہیں۔

⑦ آڑے: الف ممدودہ کے ساتھ، ہندی لفظ ہے، اس کے معنی ہے: ٹیڑھے، ترچھے، حمایت کرنا، سپر بن جانا۔ دو آدمی لڑ رہے ہوں تو بیچ میں آ کر ان کو علاحدہ علاحدہ کر دینا اور دونوں میں صلح کرا دینا۔ کہا جاتا ہے: ''فلاں معاملے میں فلاں آدمی آڑے آ گیا۔'' یعنی بیچ میں آ گیا۔ اسی طرح ہے: ''آڑے ہاتھوں لینا'' یعنی کسی کو سرزنش کرنا، برا بھلا کہنا، ڈانٹ پلانا، تنبیہ کرنا۔ سودا کا شعر ہے ؎

کیا جانے کس کے دل کا اس نے لہو پیا ہے
شانے نے آڑے ہاتھوں جو زلف کو لیا ہے

⑧ اَڑے: الف مقصورہ کے ساتھ، یہ بھی ہندی لفظ ہے۔ کہا جاتا ہے: فلاں آدمی اَڑے وقت کام میں آیا۔ اَڑے تھڑے میں کام آیا۔ یعنی تکلیف اور

مصیبت کے وقت ضرورت پوری کر دی۔ بعض دوست ''اَڑے وقت'' کو ''آڑے وقت'' بولتے اور لکھتے ہیں جو بالکل غلط ہے۔ یہ دو لفظ ہیں: پہلا آلف ممدودہ کے ساتھ۔ دوسرا الف مقصورہ کے ساتھ۔ دونوں کے معنی الگ الگ ہیں۔

⑨ اَھَمّ: عربی کا لفظ ہے اور اسمِ تفضیل ہے۔ الف اور ہا پر زبر، میم مشدد۔ اس کے معنی ہیں: بہت ضروری، بہت مشکل، نہایت سخت، انتہائی قابلِ غور معاملہ، بدرجہ غایت قابلِ عمل بات۔ بعض حضرات اسے ''اَھْم'' بولتے اور پڑھتے ہیں، یعنی الف پر زبر اور ہا پر جزم ڈال دیتے ہیں۔ یہ بالکل غلط تلفظ ہے۔ اسی سے ''اَھَمِّیَّتْ'' کی نسبت بنائی گئی ہے، یعنی کسی چیز کا بے حد لازمی اور لائقِ التفات ہونا۔ کہا جاتا ہے: ''فلاں بات یا فلاں خبر کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔'' اس میں الف اور ہا کو مفتوح کیجیے۔ میم کو مکسور اور مشدد کیجیے۔ ی پر فتحہ اور تشدید ڈالیے اور ت پر جزم۔ بعض لوگ اس کا تلفظ ''اَھْمِیَّتْ'' یا ''اھمِیَت'' کرتے ہیں، یعنی الف پر زبر ڈالتے اور ہا کو ساکن کرتے ہیں۔ پھر میم کے نیچے زیر لگا کری پر شد ڈالتے ہیں یا بغیر شد کے پڑھتے ہیں، یہ تلفظ صحیح نہیں۔

⑩ اَقَلّ: عربی لفظ ہے، جو اسمِ تفضیل ہے۔ الف اور ق مفتوح، لام پر شد۔ اس کے معنی ہیں: بہت ہی کم، کم سے کم، نہایت درجے کم، جیسے ریاضی کی اصطلاح ذو اضعافِ اقل۔ اسی سے ''اَقَلِّیَّتْ'' ہے۔ یعنی سیاسیات کی زبان میں وہ جماعت جو تعداد میں کم ہو۔ اسے بھی ''اَھَمِّیَّت'' کی طرح

پڑھنا اور بولنا چاہیے۔ الف اور ق مفتوح، لام مکسور اور مشدد، ی مشدد اور مفتوح۔ بعض حضرات اسے "اَقْلِیَتْ" پڑھتے اور بولتے ہیں، یعنی الف پر زبر ڈالتے ہیں اور ق پر جزم، لام کے نیچے زیر ڈال کر ی پر فتحہ ڈالتے ہیں یا اسے گول مول سا کر دیتے ہیں۔ یہ غلط تلفظ ہے۔

⑪ بھوت پریت: ہندی کا مرکب لفظ ہے اور مذکر ہے۔ "پریت" یائے مجہول سے پڑھتے اور بولتے ہیں، جیسے ریت بجری۔ اس کا اطلاق شیطانی اور خبیث روح پر ہوتا ہے۔

⑫ پِرِیت: اس کے ساتھ ملتا جلتا لفظ ہے اور ہندی زبان کا ہے۔ مونث ہے۔ اس کا تلفظ یائے معروف سے کیجیے۔ "پ" اور "ر" دونوں کے نیچے زیر ڈالیے۔ اس کے معنی ہیں: پیار، محبت، الفت، عشق، دوستی، اخلاص اور مروت سے پیش آنا۔

⑬ بُراق: عربی لفظ ہے اور مذکر ہے۔ "ب" مضموم اور "ر" مفتوح ہے۔ وہ خوب صورت بہشتی خچر یا گھوڑا جس پر نبی اکرم ﷺ شبِ معراج سوار ہو کر عالم بالا کی طرف تشریف لے گئے تھے۔

⑭ بَرّاق: عربی کا لفظ ہے۔ "ب" پر فتحہ، "ر" پر فتحہ بھی اور شد بھی۔ بصورتِ صفت استعمال ہوتا ہے۔ درخشاں، جگمگاتا ہوا، چمکیلا، انتہائی سفید، بجلی کی طرح تیز، ہوشیار، زیرک، تیز ذہن، ذکی، نہایت اجلا۔ کسی کا شعر ہے ؎

ضیا میں شہرہ آفاق ہو گیا اب تو
بُراق کا ہے کو بَرّاق ہو گیا اب تو

⑮ بَرَسْ: ہندی کا لفظ ہے اور مذکر ہے، اس کے معنی ہیں: سال، بارہ مہینے کی مدت۔ "ب" اور "ر" دونوں مفتوح، "س" پر جزم ہے ؎

اب کے برس بھی بیت گئے دن بہار کے

بعض لوگ اس کا تلفظ "بَرْس" کرتے ہیں، یعنی ب پر فتحہ اور "ر" ساکن۔ یہ غلط تلفظ ہے۔

⑯ کُرَہ: عربی لفظ ہے۔ "کاف" پر ضمہ اور "ر" پر فتحہ۔ ہر وہ چیز جسے گول بنایا جائے۔ ہر گول اور نسبت کے لیے کُروی۔ کرۂ آب وہ پانی (سمندر) جس نے کرۂ زمین کی خشکی کو گھیر رکھا ہے۔[1] کرۂ ارض: تمام زمین جو گیند کی طرح گول ہے۔ کرۂ ہوا: زمین کے گردا گرد کی ہوا۔ کرۂ آتش یا کرۂ نار: وہ کرہ جو ہر وقت گرم رہتا ہے۔ کسی کا شعر ہے ؎

گھر ہے مجھ سوختہ جاں کا کرۂ نار کے پاس
طائر اڑتا نہیں ہو کر مری دیوار کے پاس

لفظ "کُرَہ" کو بعض حضرات "کُرّہ" (کاف کو مضموم اور "ر" کو مفتوح اور مشدد بنا کر) پڑھتے اور بولتے ہیں، مثلاً: کُرّۂ اَرض، کُرّۂ نار، کُرّۂ آب۔ یہ صریحاً غلط ہے۔[2]

⑰ حامی: ہندی لفظ ہے اور مونث ہے، اس کے معنی ہیں: مددگار، حمایت کرنے والا، نگہبان، محافظ۔

[1] پانی کا کرہ، یعنی زمین، کیوں کہ زمین کا تین چوتھائی پانی پر مشتمل ہے۔ (نعیم الحق نعیم)
[2] فارسی میں "کُرّہ" کے معنی ہیں گدھے کا بچہ۔ (فارانی)

(۱۸) ہامی: ہندی لفظ ہے اور مونث ہے۔ اس کے معنی ہیں: اقرار کرنا، ہاں کرنا، کسی چیز کا ذمہ لینا۔ جیسے: ”میں نے اس کام کی ہامی بھر لی“، یعنی اس کی ذمے داری لے لی، اس کام کے لیے ہاں کر دی۔ اس کے برعکس حامی کے معنی ہیں: ”حمایت کرنے والا۔“

حامی اور ہامی الگ الگ دو لفظ ہیں اور اردو میں مستعمل ہیں، ان کے معنی بھی الگ الگ ہیں۔

(۱۹) تَرجَمہ: عربی لفظ ہے اور مذکر ہے۔ کسی لفظ کو ایک زبان سے دوسری زبان میں بیان کرنا۔ ”ت“ پر زبر، ”ر“ ساکن، ”جیم“ پر زبر۔ علمِ صرف کی رو سے یہ باب: ”دَحرَجَ، یُدَحْرِجُ، دَحْرَجَةً“ ہے۔

بعض لوگ ”تَرجُمہ“، جیم کے پیش کے ساتھ بولتے ہیں، جو غلط ہے۔

(۲۰) مُتَرجِم: ترجمہ کرنے والا، ایک زبان کے لفظ کو دوسری زبان میں منتقل کرنے والا۔ یہ باب: ”دَحرَجَ یُدَحرِجُ“ کا اسم فاعل ہے، جب کہ مُترجَم مفعول کا صیغہ ہے۔ بعض حضرات اس کا تلفظ ”مُتَرَجَّم“ کرتے ہیں۔ یعنی میم پر پیش، ت پر زبر، ”ر“ پر بھی زبر اور جیم پر شد بھی اور زبر بھی۔ یہ غلط تلفظ ہے۔

(۲۱) داد: فارسی لفظ ہے اور مونث ہے۔ فریاد، انصاف، عدل، عطا و بخشش، تعریف، واہ واہ۔ اسی سے ہے: داد بخش، یعنی عادل، منصف۔ داد خواہ، مظلوم، فریادی۔ دادرس، فریاد سننے والا۔ داد پانا، انصاف کو پہنچنا۔

غالب کا شعر ہے ؎

پاتا ہوں اس سے داد کچھ اپنے کلام کی
روح القدس اگرچہ مرا ہمزباں نہیں

داد کے ساتھ عام طور پر ”تحسین“ کا لفظ بھی بولا جاتا ہے۔ یہ عربی لفظ ہے اور مونث ہے، اس کے معنی ہیں: تعریف کرنا، اچھائی اور بہتری کی طرف منسوب کرنا، آفرین کہنا، کسی اچھی اور عمدہ بات پر واہ واہ کہنا، کسی کے شعر پر خوش ہو کر اس کی تعریف کرنا۔ سمجھے بغیر شعر کی تعریف کرنے کو تحسینِ ناشناس کہا جاتا ہے۔ کسی کا شعر ہے ؎

تحسینِ ناشناس کی حاجت نہیں مجھے
اللہ نے کیا ہے سخن آفریں مجھے

لفظ تحسین بصورت تانیث آتا ہے۔ شعر ہے ؎

وہ تیری ادا ہے میرے قاتل
تحسین قضا نے کی ہے جس کی

لفظ ”داد و تحسین“ ہے، یعنی شعر وغیرہ کی تعریف کرنا اور اس میں انصاف سے کام لینا۔ بعض دوست اسے دادِ تحسین بصورتِ اضافت استعمال کرتے ہیں جو غلط ہے۔ دونوں لفظوں کے ایک ہی معنی ہیں اور واؤ عاطفہ ہے۔ داد و تحسین، مترادف لفظ ہیں۔

(۲۲) قِمَار: مذکر، عربی لفظ ہے۔ قاف کے نیچے کسرہ۔ اس کے معنی: جوا، روپے پیسے کی ہار جیت کا کھیل، سیم و زر کی شرط لگا کر بازی بدنا، پاسہ کھیلنا۔

سودا کا شعر ہے ؎

سودا قمارِ عشق میں مجنوں سے کوہکن
بازی اگرچہ لے نہ سکا سر تو کھو سکا

"بدقمار" غلط کردار کے مالک اور بری عادات کے آدمی کو کہا جاتا ہے۔
بری چال چلنے والا۔ ے

ہم سا بھی اس بساط پہ کم ہو گا بدقمار
جو چال ہم چلے وہ بہت ہی بری چلے

۲۳ قوسِ قُزَح: یہ دو لفظ ہیں، قوس اور قزح۔ قوس کہتے ہیں کمان کو اور قُزَح کے معنی ہیں: دھنک۔ وہ شکل جو بارش کے بعد بادل میں مختلف رنگوں کی کمان کی مانند دکھائی دیتی ہے۔ لفظ قوس کی قزح کی طرف اضافت ہے۔ بعض حضرات قوس وقزح لکھتے ہیں یعنی درمیان میں واؤ عاطفہ ڈال دیتے ہیں جو غلط ہے۔ قُزَح قاف پر ضمہ ہے، فتحہ نہیں۔

۲۴ مُحْيِ الدِّيْن: لفظ مُحْيِ بابِ افعال (اَحْیٰ یُحْیِیْ) کا اسم فاعل کا صیغہ ہے اور لفظ "الدِّین" کی طرف اضافت کریں تو بصورتِ اسم استعمال ہوتا ہے۔ مُحْیُ الدِّیْن: "دین کو زندہ کرنے والا"، لیکن بعض لوگ "مُحَیُّ الدِّیْن" بولتے ہیں۔ میم پر پیش، ح پر زبر اور ی پر شد ڈال دیتے ہیں جو قطعاً غلط ہے۔

چند الفاظ کی صحت

حیاتِ عبداللہ۔ کہروڑ پکا

ازدحام۔ اژدہام (بھیڑ، ہجوم):

معلوم نہیں اس لفظ کو لکھنے میں پہلے کس نے غلطی کی کہ اکثر لوگوں نے اس لفظ کو اسی املا کے ساتھ لکھنا شروع کر دیا، حالانکہ اسے مذکورہ املا کے ساتھ لکھنا بالکل غلط ہے۔ درست لفظ "اِزدحام" ہے، اس کو اسی طرح ہی لکھنا چاہیے (یعنی الف، زا، دال، حائے حطی، الف اور میم)۔[1]

قریب المرگ (مرنے کے قریب):

اس لفظ کا اس طرح استعمال قطعی طور پر غلط ہے، کیوں کہ "مرگ" فارسی زبان کا لفظ ہے اور اس سے پہلے "ال" استعمال کرنا ٹھیک نہیں۔ اہلِ علم اور عربی دان بخوبی جانتے ہیں کہ "ال" کا اضافہ صرف عربی الفاظ کے شروع میں ہوتا ہے، مثلاً: المومن، الوارث، الحکیم اور المعروف وغیرہ۔

"ال" کے اضافے کا وہی مقصد ہے جو انگریزی میں "The" کے استعمال کا ہے، چنانچہ فارسی زبان کے لفظ سے پہلے "ال" کا اضافہ کرنا درست نہیں۔ اسے قریب مرگ یا قریب بہ مرگ لکھنا اور بولنا چاہیے۔

[1] غالب نے "اژدہام" استعمال کیا ہے، لہٰذا اسے بھی قبول کرنا چاہیے۔ (فارانی)

باغچہ۔ باغیچہ:

یہ اسم مصغر ہے اور چھوٹے باغ کے لیے مستعمل ہے، لیکن قواعد کی رو سے یہ لفظ یوں ٹھیک نہیں۔ درست ''باغچہ'' ہے۔ یعنی با، الف، غین، چے اور ہائے ہوز۔ غین کے بعد یائے معروف کا استعمال نہیں کرنا چاہیے، جس طرح طاق کا اسم مصغر طاقچہ اور دیگ کا دیگچہ ہے، بعینہٖ باغ سے باغچہ ہونا چاہیے نہ کہ باغیچہ۔

اَسامی۔ آسامی:

یہ لفظ گاہک، عہدہ اور نوکری کی جگہ کے لیے عام استعمال میں آتا ہے۔ اکثر اخبار ''خالی آسامیوں'' کے عنوان سے اشتہارات شائع کرتے ہیں جن میں اس لفظ کو الف ممدودہ کے ساتھ لکھ دیا جاتا ہے، حالانکہ یہ بہت بڑی غلطی ہے، اسے الف ممدودہ کے بجائے بالفتح ''اَسامی'' لکھنا چاہیے۔

''اردو'' کے معنی ''لشکر گاہ'' کے ہیں۔ یہ نام اس لیے معروف ہوگیا کہ یہ مختلف زبانوں کا مجموعہ ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اردو زبان کا دامن بڑا وسیع ہے، مگر اس زبان کے قواعد بہر حال موجود ہیں۔ بہت سے الفاظ کی غلط املا اتنی عام ہو چکی ہے کہ اگر کوئی صاحبِ مضمون اپنی تحریر میں درست لکھ بھی دے تو اخبار یا رسالے کا مدیر اسے غلط سمجھ کر غلط بنا دیتا ہے۔

اخبارات کے مدیر ''گاہے گاہے'' کو ''گاہے بگاہے'' اور ''بے پروا'' کو ''لاپروا'' بنانے میں ذرا تامل نہیں کرتے۔ یہ صورتِ حال بڑی افسوس ناک ہے۔ چند رسائل الفاظ کی صحت کے متعلق مضامین شائع کرتے ہیں جو ناکافی ہیں۔ زبان کی اصلاح کے لیے ملکی سطح پر کسی ایسے ادارے کا قیام ضروری ہے جو الفاظ اور زبان کی درستی کے لیے سنجیدہ کوشش کرے۔ ذیل میں چند ایسے الفاظ کی اصلاح دی گئی ہے جو عام استعمال میں آتے ہیں:

عجوبہ: (عجیب، نادر اور انوکھا) اُغلوطہ، اُضحوکہ اور اُعلومہ کے وزن پر یہ لفظ ''اُعجوبہ'' ہے، چنانچہ ''عجوبہ'' کا استعمال ترک کر دینا چاہیے۔

کوائف: دفاتر میں اس لفظ کو کیفیت کی جمع کے طور پر بے دھڑک استعمال کیا جا رہا ہے، مگر یہ غلط ہے، کیفیت کی جمع کیفیات ہے، کوائف نہیں۔

کھہ، بھہ اور سھہ: اس قسم کے الفاظ کے آخر میں عموماً دو ہائے ہوز لکھ دی

جاتی ہیں۔ املا کے ساتھ اگر ان کا مصدر بنایا جائے تو کتنی مضحکہ خیز صورتِ حال پیدا ہو جائے گی۔ ان الفاظ کو صرف ایک ''ہا'' (یعنی کہ، بہ اور سہ) کے ساتھ لکھنا چاہیے۔ لفظ ''شبہہ'' اور ''قہقہہ'' کے ساتھ الٹا عمل ہوتا ہے، یعنی ان الفاظ کے آخر میں دو ہائے ہوز لکھنی چاہیے، مگر ایک لکھ دی جاتی ہے۔

علاحدہ: یہ دو الفاظ ''علیٰ'' اور ''حِدَۃِ'' کا مجموعہ ہے۔ عربی زبان میں ان الفاظ کو کبھی ملا کر نہیں لکھا جاتا، مگر اردو میں لوگ اسے علحدہ اور علیحدہ لکھتے ہیں، بہتر ہے کہ اردو میں اسے ''علاحدہ'' لکھا جائے۔

مھندی: میں نے کسی اخبار یا رسالے میں یہ لفظ درست املا کے ساتھ لکھا نہیں دیکھا، عموماً نون غنہ ہائے ہوز کے بعد لکھی جاتی ہے، جب کہ یہ ہائے ہوز سے پہلے لکھنی چاہیے، یعنی منہدی۔

میں اکثر اپنے دوستوں کو یہ بات کہتا ہوں کہ اردو زبان کو بگاڑنے میں اساتذہ، خطبا اور صحافیوں نے نمایاں کردار ادا کیا ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ ان تین طبقوں سے تعلق رکھنے والے لوگ ہی اردو زبان کی اصلاح میں اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔

چند ایسے الفاظ پر توجہ دیجیے جنھیں بڑے دھڑلے کے ساتھ غلط لکھا جا رہا ہے۔

جانثار: شاید ہی کوئی اخبار یا رسالہ اس لفظ کو درست املا کے ساتھ لکھتا ہو۔ ''جا'' فارسی زبان کا لفظ ہے، اس کے معانی ہیں: جگہ، مقام، ٹھکانا۔ ''جانا'' مصدر سے یہ صیغہ امر بھی ہے۔ ''جانثار'' کے معانی ''جگہ قربان کرنے'' کے ہوئے، جب کہ جملے میں جان قربان کرنے کی بات ہوتی ہے۔ درست لفظ ''جاں نثار'' ہونا چاہیے، مگر املا میں نون غنہ کو حذف کر کے اسے ''جانثار'' بنا دیا جاتا ہے جو غلط ہے۔

خوردبین: خوردبین کیا ہے؟ اس کے متعلق لوگ اچھی طرح جانتے ہیں، مگر یہ بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ اس کی درست املا خوردبین نہیں، بلکہ ''خردبین'' ہے۔ ''خرد'' فارسی زبان کا لفظ ہے اس کے معانی ہیں: چھوٹا، کم عمر وغیرہ۔ ''بین'' بھی فارسی زبان ہی کا لفظ ہے۔ یہ مرکبات میں استعمال ہوتا ہے۔ اس کے معنی ہیں: ''دیکھنے والا'' چنانچہ ''خردبین'' کا مطلب ہے: ''وہ آلہ

جس کی مدد سے چھوٹی چیز کو دیکھا جائے۔" اب خوردبین پر غور کریں۔ "خورد" کا معنی ہے "کھانا" جب کہ "بین" کا مطلب اوپر لکھا جا چکا ہے۔ یقیناً آپ جان گئے ہوں گے: "خوردبین" لکھنے سے معانی کیا سے کیا ہو گئے؟!

اسب گول: "اسب گول تے کچھ نہ پھرول" مگر جناب! ہم کچھ نہ کچھ ضرور "پھرولیں" گے، اس لیے کہ "اسب گول" یا "اسب غول" دونوں ہی غلط ہیں۔ درست لفظ: "اسپ غول" ہے۔

"اسپ" فارسی میں گھوڑے کو کہتے ہیں اور "غول" کا مطلب ہے "کان"۔ چونکہ اس کا پودا گھوڑے کے کان جیسا ہوتا ہے، اس لیے اسے "اسپ غول" کہا جانے لگا، مگر یار لوگوں نے اسے "اسب گول" بنا کر رکھ دیا۔

رھایش: رہیدن سے حاصل مصدر ہے۔ معانی ہیں: "نجات، چھٹکارا یا خلاصی۔" معلوم نہیں کہ اسے قیام اور سکونت کے لیے کس نے اور کیوں استعمال کرنا شروع کر دیا۔ کیا میں توقع رکھوں کہ آج کے بعد آپ اس لفظ کو قیام اور سکونت کے لیے استعمال نہیں کریں گے؟

وطیرہ: وطیرہ بے معنی لفظ ہے۔ درست لفظ "وتیرہ" ہے، اس کا مادہ "وتر" ہے اور معانی ہیں: "دستور، روش، نہاد وغیرہ۔" امید ہے آج سے آپ اس لفظ کو درست املا کے ساتھ لکھنے کا "وتیرہ" اپنائیں گے۔

قرضِ حسنہ: ایک جملہ ملاحظہ کیجیے: "میں نے اسلم سے قرضِ حسنہ لیا ہے۔" فقرے کے آخر میں "لیا ہے۔" اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ "قرض" اردو میں مذکر ہے مونث نہیں۔ اس لیے قرضِ حسنہ کے بجائے "قرض

حسن" لکھنا اور بولنا چاہیے، چنانچہ درست فقرہ یوں ہو گا: "میں نے اسلم سے قرضِ حسن لیا ہے۔"

مخیر: بہت سے خطیب اپنے مدارس کی تعمیر کے لیے چندہ اکٹھا کرتے وقت یہ جملہ بولتے ہیں: "مخیّر حضرات سے تعاون کی اپیل ہے۔" یہ لوگ سخی یا فیاض کے لیے مخیّر کا لفظ استعمال کرتے ہیں، جب کہ مخیّر اگر "ی" کی زیر سے پڑھیں تو اس کے معنی ہیں: "کسی معاملے میں اختیار دینے والا" (اسم فاعل) اور اگر "ی" کی زبر سے پڑھیں (اسم مفعول) تو وہ شخص جس کو اختیار دیا گیا ہو۔ سخی یا فیاض کے لیے "خیّر" استعمال کیجیے: "خ" پر زبر، "ی" پر زیر اور شد اور "ر" پر جزم۔

سنہری موقع: "امتحان میں کامیابی کا یہ سنہری موقع ہے۔" لفظ موقع مذکر ہے، چنانچہ اس کے ساتھ سنہری کے بجائے "سنہرا" لکھنا اور بولنا چاہیے۔[1]

---
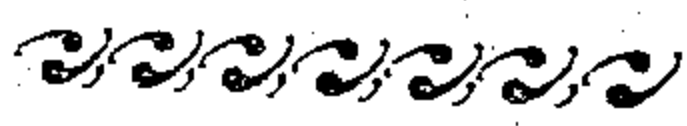
[1] اسوۂ حسنہ (قرآنی ترکیب) کی طرح "قرضِ حسنہ" (اردو ترکیب) کو اب قبولِ عام حاصل ہے اور یہی معاملہ اہلِ خیر کے معنی میں "مخیّر" کا ہے، لہٰذا انھیں اردو سے خارج نہیں کیا جا سکتا، جیسے لفظ "عورت" اپنے عربی معنی سے ہٹ کر اردو میں شامل ہوا ہے۔ جہاں تک "سنہری" کا تعلق ہے تو اس کا تعلق رنگوں کو ظاہر کرنے والے اسمائے صفت سے ہے، جو مذکر اور مونث دونوں طرح استعمال ہوتے ہیں، مثلاً: ارغوانی، روپہلی، گلابی، کتھئی وغیرہ۔ ان کی "یا" کو "الف" میں بدلنا ضروری نہیں۔ "سنہری ریشہ، گلابی چہرہ" درست ترکیبیں ہیں۔ (فارانی)

استدراک

پروفیسر محمد سعید عابد (قصور)

''الاعتصام'' کے شمارہ نمبر (42) میں جناب حیات عبداللہ کا مضمون بہ عنوان ''چند الفاظ کی صحت'' نظر سے گزرا۔ مضمون نگار موصوف کی صحتِ زبان کے ساتھ دل چسپی اور روز افزوں اغلاطِ زبان پر فکر مندی قابلِ قدر ہے۔ انھوں نے بعض الفاظ کی املا اور ان کے تلفظ کی درستی کی طرف بجا طور پر توجہ دلائی ہے، اس لیے کہ تلفظ اور املا کی صحت ہی کسی زبان کی خوب صورتی، ثقاہت اور ''صحت'' کی محافظ ہوتی ہے۔

مگر بعض الفاظ کے بارے میں اس قدر حساسیت غیر ضروری سمجھی جاتی ہے۔ لفظ ''رہائش'' اسی قسم کے الفاظ میں شامل ہے، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس لفظ کو اردو کے تمام لغت نویسوں نے اپنی مرتب کردہ کتابوں میں باقاعدہ جگہ دی ہے۔ گویا اپنی بناوٹ کے لحاظ سے غلط ہونے کے باوجود اسے انھی مروج معانی کے لیے قبول کر لیا گیا ہے۔ مثلاً: فرہنگ کارواں کے جامع فضل الٰہی عارف مرحوم اس لفظ کے ذیل میں لکھتے ہیں: (ا۔ مونث) سکونت، رہنا۔ یہ لفظ مصدر سے خلافِ قاعدہ بنا لیا گیا ہے۔

(گویا فارسی مصدر ''رہیدن'' سے اس کا کوئی تعلق ہی نہیں) اور غلط

ہونے کے باوجود بہ کثرت مستعمل ہے۔

صاحبِ نسیم اللغات اس کے معانی یوں بیان کرتے ہیں۔

(ا۔مو) سکونت، قیام، ٹھکانا، گنجایش، ضبط، برداشت۔ (فارسی میں غلط)

قوسین کے الفاظ غور طلب ہیں، جن سے یہ مفہوم ٹپک رہا ہے کہ یہ لفظ اردو میں غلط نہیں۔

فرہنگِ آصفیہ میں متعلقہ باب دیکھیے:

رہائش یا رہاس۔ ہ، اسم مونث۔ عوام (کے ہاں)، سکونت، مسکن، قیام، بود و باش، بساست، گھر، ٹھکانا، ماوا۔

مدعا اس ساری گفتگو کا یہ ہے کہ اس لفظ پر علمی بحث برحق، مگر اس کا استعمال ترک کرنے پر زور دینا غیر ضروری ہے۔ یہی حال لفظ ''مخیّر'' کا ہے۔

اس لفظ کے باب میں مضمون نگار نے جو کچھ لکھا ہے، اس کا لفظ لفظ عین حق ہے، مگر اردو لغت نویسوں نے اس لفظ کے معانی میں بغیر کسی تحفظ کے (لفظ رہائش کے برعکس) سخی اور فیاض بھی درج کیے ہیں۔ ویسے بھی اپنے بنیادی مادے (Basic Root) ''خ، ی، ر'' کے اشتراک کے سبب اس میں خیر، بھلائی اور عملِ خیر کا معنی و مفہوم موجود ہے۔ اس لیے لفظ مخیّر کے معنی جہاں اختیار دینے والے کے ہیں، وہاں عملِ خیر کرنے والے کے بھی ہیں اور سباق و سیاق عبارت میں اس کا کوئی ایک معنی متعین کر دیتا ہے۔

شاید اسی لیے اہلِ لغت نے اس کے معانی میں بغیر کسی اضافی وضاحت کے سخی اور فیاض کا اضافہ کر دیا ہے، لہٰذا اردو خواں حضرات کو ''خَیِّر'' کے تکلف

بلکہ چکر میں ڈالنا انھیں غیر ضروری مشقت میں مبتلا کرنے کے مترادف ہے۔

مزید برآں "بخیر" کا لفظ اسم فاعل کے معروف وزن پر ہونے کی بنا پر مانوس بھی ہے اور سہل بھی۔

لفظ اسپغول کے سلسلے میں عرض ہے کہ یہ واقعی غولِ اسپ کی مقلوبی حالت ہے اور معنی وہی "گھوڑے کے کان" ہیں، مگر اس کی مشابہت اس کے پودے میں تلاش کرنے کی ضرورت نہیں، خود اس کے بیج کی گھوڑے کے کان سے مشابہت نہایت واضح ہے۔

یہ درست ہے کہ مذکر کے لیے سنہرا اور مونث کے لیے سنہری صفت لانا جائز ہے، مگر لازم نہیں۔ قطع نظر تذکیر و تانیث کے ہر دو کے لیے سنہری بھی بطورِ صفت کے مستعمل ہے، بلکہ زیادہ فصیح سمجھا جاتا ہے۔[1]

سند کے لیے استاد امام بخش ناسخ کا شعر پیشِ خدمت ہے ؎

وصف جب میں نے کیے تیرے سنہری رنگ کے
خود بخود ہر صفحۂ دیواں مُذَھّب ہو گیا

(فرہنگِ آصفیہ)

[1] حیات عبداللہ صاحب نے "سنہری موقع" کو غلط اور "سنہرا موقع" کو درست جانا ہے۔ اس طرح تو "گلابی چہرہ" کو "گلابا" کرنا پڑے گا جو مضحکہ خیز ہوگا۔ (فارانی)

غلط العوام الفاظ کی اصلاح

فضل اکبر کاشمیری۔ کراچی

اردو زبان کے قواعد منضبط ہیں، اس کی فصاحت و بلاغت کی بحثوں میں رسالے شائع ہوتے ہیں اور اس کے ایک ایک لفظ کی سند مہیا ہے۔ اردو پیدا ہوئی دہلی میں، پلی دہلی میں، پھیلی ہندوستان کے مختلف حصوں میں اور سنواری گئی لکھنؤ میں۔ یہی وجہ ہے کہ اردو کی قلم رو پر دہلی اور لکھنؤ کے ادیبوں کا قبضہ تسلیم کر لیا گیا اور اردو زبان دہلی اور لکھنؤ ہی کی سند مان لی گئی۔ انھی دونوں مقاموں کے فصحاء نے جن الفاظ اور محاورات کو مستند کہہ دیا، وہی مستند سمجھ لیے گئے اور جن کو متروک یا غیر فصیح قرار دے دیا، وہ ٹکسال سے باہر ہو گئے۔

اردو چونکہ پاکستان کی قومی زبان ہے اور یہاں اکثر کتب، رسائل، اخبارات اردو ہی میں شائع ہوتے ہیں، اس لیے اردو قارئین کے افادے کے لیے یہ مضمون لکھا گیا ہے۔

غلط العوام: وہ لفظ جسے عوام نے تلفظ یا رد و بدل کے ساتھ بولنا شروع کر دیا ہو، وہ غلط ہی قرار پاتا ہے۔ مضمون ہذا میں انتہائی اختصار کے ساتھ ایسی ہی چند چیزوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ درج ذیل الفاظ کا اس طرح لکھنا درست ہے:

خط کتابت: اس کا مطلب ہے خط کا لکھنا، اس میں واؤ نہیں آتا۔ اس پر میر تقی میر

کا یہ شعر دال ہے ؎

خط کتابت سے یہ کہتے تھے نہ بھولیں گے تجھے

آویں گے گھر بار کی تیرے خبر کو بار بار

الف پر ختم ہونے والے ہندی حروف کو ''الف'' اور ''ہا'' دونوں کے ساتھ لکھنا درست ہے، لیکن عربی حروف جو ''ہا'' پر ختم ہوتے ہیں، ان کو ''ہا'' ہی کے ساتھ لکھا جائے۔ اگر لفظ ''ع'' پر ختم ہو تو امالہ نہیں کرنا چاہیے۔

معرکہ آرا: معرکۃ الآراء لکھنا غلط ہے۔ شاعرِ مشرق فرماتے ہیں ؎

تھے ہمیں ایک ترے معرکہ آراؤں میں

وتیرہ: اس کو وطیرہ لکھنا غلط ہے۔

روداد: روئیداد غلط ہے۔

خاصا مشکل: کافی مشکل، درست نہیں۔ کافی اس کو کہتے ہیں جو کفایت کر جائے۔

چاق چوبند: اس میں واؤ نہیں آتا۔

عجز وانکسار: عجز وانکساری لکھنا غلط ہے، البتہ ''عاجزی اور انکسار'' لکھنا صحیح ہے۔

بلند بانگ: اس میں واؤ لکھنا غلط ہے۔

بے نیل مرام: اس کو بھی واؤ کے بغیر لکھنا درست ہے۔

ؐ، ؒ، ؓ، ؑ، کو بالترتیب صلی اللہ علیہ وسلم، رحمہ اللہ، رضی اللہ عنہ، علیہ السلام ہی لکھا جائے۔

ان شاء اللہ: قرآن میں اسی طرح لکھا ہوا ہے۔ دیکھیے: [سورة البقرة: ۷۰، الفتح: ۲۷]

انشا مضمون نویسی کو کہتے ہیں، نیز انشاء اللہ خان انشا ایک شاعر کا نام بھی ہے۔

ناراضی، علانیہ، قراءت، دھوکا، پتا، دُکان، اذان، ائمہ۔

استفادہ کرنا: استفادہ حاصل کرنا غلط ہے۔

ذریعے سے: ایسے لکھنا ہی فصیح ہے۔

دوران میں: دوران کے ساتھ ''میں'' لکھنا لازم ہے۔

''درمیان'' کے ساتھ ''میں'' نہیں آتا، کیوں کہ ''در'' کے معنی ہیں ''میں'' اور میان کے معنی ہیں بیچ۔

تابعدار لکھنا غلط العام ہے، صرف تابع لکھنا چاہیے۔

بمعہ لکھنا غلط ہے، کیوں کہ ''ب'' اور مع کا ایک ہی معنی ہے۔ بمعہ لکھنا اجتماعِ مترادفین ہے، صرف مع لکھنا کافی ہے، مثلاً: آپ کی ارسال کردہ کتاب مع خط موصول ہوئی۔

قسم کھانا: حلف اٹھانا اور قسم کھانا درست ہیں، مگر قسم اٹھانا غلط ہے۔

درست تلفظ:

غَلَط، (لام کی جزم کے ساتھ غلط ہے) وَرَاثت، وُصول، هَذیان، هونُهار، هُویدا، یکم، نِنانوے، کِرایه، مُطَّلع، مَبْلَغ، نِچوڑ، نِڈر، نَشاط، نَشأةِ ثانیه، نَشاسته، نَظاره، نُمایش، نُمونه، نُمونیا، صِحاح، سَرقه، عِطر، وِزارت، زِراعت، اِمارت، عُشرِ عشیر، سِفارِش، ذِهانت، دِلاسا، فِرار، رِفعت، عُنصُر، مِٹی، مَتّی، سُقم، اِکسیر، حَجُم، مَذَمَّتُ، مَرَمَّتُ، اُعجوبه، عِرق النَساء، مَشهور، عُمرانیات، سَمت، شَکُل، مَحبت، بهُت، سَحری، غَلَط فَهمی، نِواله، سَفید، تجرِبه، ترجَمه، مَحلّه، (بضم اول غلط العام ہے)، مُحال، رِٹ، باهَر، لَذَّت، غَلَطی، حَجة الوداع، عِظَام (1) عظیم کی جمع، (2) عَظم کی جمع،

ہڈیاں۔ عُظّام (بزرگ، بڑا)، فُضول، نَجات۔

نَفَل: زبانوں پر بکسرِ دوم ہے۔

نِقاب: زبانوں پر بفتح اول ہے۔

شَکوہ: زبانوں پر بکسرِ اول ہے۔

تذکیر و تانیث (Genders):

❀ تمام مہینوں کے نام مذکر ہیں۔

❀ زمین کے علاوہ تمام سیاروں اور اجرامِ فلکی کے نام مذکر ہیں۔

❀ تمام دنوں کے نام مذکر ہیں، سوائے جمعرات کے۔

❀ تمام دھاتوں کے نام مذکر ہیں، مگر قلعی اور چاندی مونث ہیں۔

❀ گنگا اور جمنا کے سوا تمام دریاؤں، پہاڑوں اور سمندروں کے نام مذکر ہیں۔

❀ تمام شہروں کے نام مذکر ہیں۔ ایک تحقیق کے مطابق جب دہلی کو دلّی بولا جائے تو وہ مونث ہے۔ بقول اقبال ؎

سوادِ رومتہ الکبریٰ میں دلّی یاد آتی ہے

❀ درج ذیل الفاظ مذکر ہیں:

اوقات، سائنس، کرتُوت، جزم، قالین، پستول، لالچ، ٹکٹ، حلیم، زبر، عِطر، سگریٹ، کمپوزنگ، پیش، بریک، رنگ، نب، رش، گندم، تار، زہر، ٹریفک، دہی، جھاگ، ٹی وی، ٹیپ، فوٹو، پت، میل، چرس، تُھوک، چاکلیٹ، فرِج، عوام، (مثلاً: سارے عوام کہتے ہیں۔ ساری عوام کہتی ہے، غلط ہے) مزاج، ہوش، عیش، جہنم، دوزخ، مرض، قبض، کلام، انتظار، گوند، ماضی، انجیر، لغت، اخبار، درد،

مانند، پٹ سن، مرہم۔

❀ درج ذیل الفاظ مونث ہیں:

شانِ نزول، درگزر، ترازو، کیچڑ، جدول، جمپر، چپل، محراب، منبر، گھاس، ناک، بارود، سائیکل، ڈکار، پتنگ، جامن، شطرنج۔

❀ درج ذیل الفاظ مذکر و مونث دونوں طرح بولے جاتے ہیں:

لبیک: جلال نے مذکر لکھا ہے۔ زبانوں پر تانیث کے ساتھ ہی ہے۔

گیند: لکھنؤ میں مذکر، دہلی میں مؤنث ہے۔

ستارے ترے دیکھے بھالے ہوئے ہیں
یہ سب گیند ان کے اچھالے ہوئے ہیں
(امیرؔ)

جی کلائی کی نزاکت سے دھڑکتا ہے میرا
ہاتھ میں گیند اٹھا تم نے اچھالی بے ڈھب
(ظفرؔ)

شرائط: لکھنؤ میں مذکر، دہلی میں مونث۔

سانس: (مونث) اہلِ دہلی مذکر بھی بولتے ہیں۔

فکر: (مونث) تذکیر و تانیث مختلف فیہ۔ لکھنؤ میں مذکر مستعمل ہے۔

اب دہلی میں مذکر و مونث اور لکھنؤ میں مونث ہی مستعمل ہے۔

قرار آ ہی گیا غم میں جی سنبھل ہی گیا
گئے وہ دن کہ جو تھا فکر جان جانے کا
(امیرؔ)

فکر ہے ان کو متاعِ حسن کے نیلام کی
سیر ہو چھوٹے اگر بولی ہمارے نام کی

(اسیر)

بعض محققین کے نزدیک خیال کے معنی میں مذکر ہے اور پریشانی کے معنی میں مؤنث ہے۔[1]

بلبل: تذکیر و تانیث مختلف فیہ ہے۔

لی کاروانِ گل نے خزاں میں عدم کی راہ
بلبل پھڑک پھڑک کے گلستاں میں رہ گئے

(اسیر)

اے صبا باغ میں تم نالۂ سوزاں نہ کرو
اشک سے بلبلِ بے برگ و نوا جلتی ہے

موتیا: دہلی میں مونث، لکھنؤ میں مذکر۔

دل کی کلی نہ تجھ سے کبھی اے صبا کھلی
چمپا کھلی، گلاب کھلا، موتیا کھلی

(داغ)

موتیا چار سمت پھولا ہے
باغ سارا پڑا مہکتا ہے

(تسلیم)

---

[1] اقبال نے فکر (خیال) مذکر باندھا ہے ؎
شوقِ بے پروا گیا فکرِ فلک پیما گیا
تیری محفل میں نہ دیوانے نہ فرزانے رہے
(قارانی)

وجوہ: لکھنؤ میں مذکر، دہلی میں مونث۔

ہراس: لکھنو میں مذکر، دہلی میں مونث۔

قیف: لکھنؤ میں مونث، دہلی میں مذکر۔

تراکیب: (مونث)، لکھنؤ میں مذکر ہے۔

قمیص: (مونث)، جلال و جلیل نے مذکر لکھا ہے۔

حلق: (مونث)، دہلی میں مذکر ہے۔

نشوونما: تذکیر و تانیث مختلف فیہ، ترجیح تانیث کو ہے۔

خط کو روئے یار پر نشوونما ہوتا نہیں
سبزۂ بیگانہ گل سے آشنا ہوتا نہیں

(ناسخ)

چشمِ پُر آب سے ہے نشوونما ساون کی
نفس سرد نے باندھی ہے ہوا ساون کی

(صبا)

کلمات: دہلی میں مونث، لکھنؤ میں مذکر۔

بٹیر: دہلی میں مونث، لکھنؤ میں مذکر و مونث دونوں طرح بولے جاتے ہیں۔

گزند: تذکیر و تانیث میں اختلاف ہے۔

یہ تیرے افعیِ گیسو کا زہر ہے قاتل
پڑا جو سانپ پہ سایہ اسے گزند ہوا

(وزیر)

گیسوئے یار سے کس کس کو گزندیں پہنچیں
اڑ کے کاٹا کیا یہ افعیٔ رہزن کیا کیا

(صباؔ)

نقاب: تذکر و تانیث مختلف فیہ ہے۔

طرز: تذکیر و تانیث مختلف فیہ ہے۔ مولوی نور الحسن نیّر مرحوم کی رائے میں ترجیح تذکیر کو ہے۔

مالا: دہلی میں مونث، لکھنؤ میں مذکر۔

سلسلہ اشک کا توڑے تو مرا دیدۂ تر
موتیوں کی نہ کرو تم ابھی مالا ٹھنڈی

(اسیرؔ)

متاع: تذکیر و تانیث مختلف فیہ ہے۔ ترجیح تانیث کو ہے۔

املا: (مذکر) رشک نے مونث بھی کہا ہے۔

عالمِ وحشت میں جب لکھا کوئی خطِ فراق
ربط بگڑا، میری انشا کا غلط املا ہوا

(تسلیمؔ)

نامۂ جاناں ہے یا لکھا مری تقدیر کا
خط کی انشا اور ہے لکھنے کی املا اور ہے

(رشکؔ)

کِلک: تذکیر و تانیث مختلف فیہ ہے۔ کثرتِ استعمال تذکیر کے ساتھ ہے۔

زورِ طبیعت سے مرا کلکِ فکر
بازوئے اقلیم کشا ہو گیا

(اسیرؔ)

کی عطا نو خطوں کو کلکِ ادا
کیا عاشق کو تختۂ مشقِ جفا

(ذوقؔ)

جہات: لکھنؤ میں مذکر، دہلی میں مونث۔

نفل: (مونث)، دہلی میں مذکر ہے۔ لکھنؤ میں اس کی جمع نفلیں ہیں۔

پریٹ: دہلی میں مذکر، لکھنؤ میں مونث۔

حکایات: لکھنو میں مذکر، دہلی میں مونث۔

میم: (مذکر)، رشک نے مونث کہا ہے، ترجیح تذکیر کو ہے۔

محمل: ناصر نے مونث کہا ہے، لیکن اب کثرتِ استعمال تذکیر کے ساتھ ہے۔

قیس کا ہے یہ بگولے پہ گماں
میری لیلیٰ کی یہ محمل ہو گی

(اسیرؔ)

دیکھ سینے کو ترے سانس لگا رکھا ہے
ورنہ بیمارِ غمِ ہجر میں کیا رکھا ہے

(داغؔ)

مُحک: مختلف فیہ، ترجیح تانیث کو ہے۔

نفاق اس سے نہاں کیا ہو چھپے شرکِ خفی کیوں کر
محک ہے اس کا سنگِ آستانہ نیک اور بد کا
(ناسخ)

دیکھو نگاہِ قہر سے کھل جائے حالِ عشق
آنکھوں میں پتلیاں ہیں محک امتحان کی
(منیر)

قُلقل: اس کی تذکیر وتانیث میں اختلاف ہے۔

قلم: (لکھنے کا آلہ) بالاتفاق مذکر ہے۔ بعض مونث بھی کہتے تھے۔

عجب احوال ہے میرا کہ جب خط اس کو لکھتا ہوں
تو دل کچھ اور کہتا ہے، قلم کچھ اور کہتی ہے
(ظفر)

وصفِ ابرو بعد مژگاں کے جو میں لکھنے لگا
تیر سا سیدھا قلم مثلِ کماں خم ہو گیا
(ناسخ)

قیود: (مذکر)، دہلی میں مونث ہے۔

حدود: لکھنؤ میں مذکر، دہلی میں مونث ہے۔

اس کے علاوہ ڈیڑھ درجن الفاظ ایسے ہیں جو ایک معنی میں مذکر اور دوسرے معنی میں مؤنث ہیں۔